رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۲۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ　　　جلد ۳۶　　　عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک" اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے　　　اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards Understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism What ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE
(Pakistan)

فہرست مضامین

ماہ جمادی الآخرہ ۱۳۶۲ھ (جون ۱۹۴۳ء) جلد ۲۲ عدد ۶ -

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

فوجوں کی نقل و حرکت، منظم جماعتوں کی سرگرمیاں اور بڑے بڑے اداروں کے کام دیکھ کر عموماً لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ اصل چیز جماعتی تنظیم ہے، افراد چاہے جیسے بھی ہوں، تنظیم اگر مکمل اور مستحکم ہے تو کامیابی اس کے قدم چوم کر رہتی ہے۔ اسی طرح اجتماعی نظامات کی قیل و قال اور مختلف اجتماعی فلسفوں کی کاغذی بحثیں سن کر اور پڑھ کر بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ اجتماعی نظام ہی سب کچھ ہے، وہ اگر صحیح اور منصفانہ ہو اور پر زور جد و جہد سے قائم کر دیا جائے تو انسانیت کی فلاح یقینی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تنظیم تنظیم کا شور برپا ہے اور دوسری طرف اجتماعی نظاموں پر سرگرم علمی و نظری بحثیں ہو رہی ہیں۔ گویا ایک اچھی منظم جماعت کا وجود میں آجانا اور ایک مکمل اجتماعی نظام، اس کی صحت اور اس کے بقاء و استحکام کا سارا انحصار اُن افراد کی سیرت و کردار پر ہوتا ہے جو اس ظاہری عمارت کے اندر اینٹوں کی طرح جوڑے جاتے ہیں۔ اگرچہ ضبط و نظم کے قاعدے اور اجتماع کے اصول بھی اپنے اندر بہت کچھ اہمیت رکھتے ہیں، لیکن سیلابِ حوادث کا اصل مقابلہ اور عملی زندگی کی آزمائشوں کا حقیقی سابقہ قاعدوں اور اُصولوں سے نہیں بلکہ ان کو چلانے والے افراد سے پیش آتا ہے۔ دنیا کی امتحان گاہ میں ضابطے اور اصول نہیں اُترتے، افراد اُترتے ہیں اور انہی کی طاقت وہ آخری طاقت ہوتی ہے جس پر امتحان کے فیصلے کا مدار ہوتا ہے۔ جماعتی ضبط خواہ کتنا ہی مکمّل ہو اور اجتماع کے اصول چاہے کتنے ہی صحیح ہوں، لیکن اگر انفرادی سیرتیں عمدہ اور پختہ نہ ہوں تو نہ ضابطے اور قاعدے کسی کام آتے ہیں نہ اصول۔ زمانے کا طوفان بند کی ایک ایک اینٹ کو آزماتا ہے اور جہاں چند کمزور اینٹیں اُسے ہل جاتی ہیں وہیں سے رخنہ پیدا کر کے اپنا راستہ نکال لیتا ہے، پھر نہ انجنیری کے وہ اصول کچھ بنا سکتے ہیں جن سے بند کی تعمیر میں کام لیا گیا ہو اور نہ وہ بندشیں ہی سیلاب کا منہ پھیر سکتی ہیں جن سے اینٹوں کو جوڑا گیا ہو۔

اس وقت دنیا میں بڑی بڑی قوموں کے درمیان جو عظیم الشان تصادم برپا ہے اس میں اصلی فیصلہ کن طاقت افراد کی طاقت ہے نہ کہ تمدنی اصولوں کی طاقت یا فوجوں اور پارٹیوں کے ڈسپلن کی طاقت۔ یہ لڑائی کشمکش کرنے والی قوموں کے ایک ایک فرد کی قوتِ تحمل کا امتحان لے رہی ہے۔ ایک ایک قوم کو دنیا تپا کر دیکھ رہی ہے کہ اس کے افراد میں کتنا صبر ہے، مصیبتوں اور صدموں کی کتنی برداشت ہے، نقصان اٹھانے کا کتنا حوصلہ ہے، خواہشاتِ نفس پر کتنا قابو ہے، شخصی مفاد کو قربان کرنے کی کتنی طاقت ہے، جماعتی یا قومی نصب العین کا کتنا عشق ہے اور پروانہ وار اس پر فدا ہو جانے اور اپنا سب کچھ فدا کر دینے کی کتنی جرأت ہے۔ اس آزمائش میں جن قوموں کے افراد بودے ثابت ہوئے وہ گر چکی ہیں، جن کی طاقت آگے چل کر جواب دے جائے گی وہ شکست کھا جائیں گی، اور جن کے افراد کی سیرت سب سے زیادہ مضبوط ثابت ہوگی وہی آخر کار فتح یاب نکلیں گی۔ فرانس کے سب سے پہلے گر جانے کا سبب اس کے سوا کیا تھا کہ اس کی انفرادی اخلاق کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ حال میں اٹلی کے قومی وقار کو کس چیز نے پامال کرا دیا؟ کیا وہ اس کے سوا کچھ تھی کہ اطالویوں کی انفرادی سیرتیں اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کمزور نکلیں؟ حتیٰ کہ فاشیت کی تنظیم اور جرمنوں کی پشت پناہی بھی اس کمزوری کی تلافی کرنے سے عاجز ہو گئی۔ جرمنی اور انگلستان نے ایک دوسرے پر جو ہولناک ہوائی حملے کیے اور بحری مغازیں دونوں نے ایک دوسرے کو جو زبردست نقصانات پہنچائے ان کے مقابلہ میں کیا محض تنظیم اور تمدنی اصولوں کے بل بوتے پر یہ قومیں ٹھیر سکتی تھیں؟ اگر ان میں سے کسی ایک کے افراد کی اخلاقی طاقت بھی جواب دے جاتی تو یہ کاری ضربیں سہہ جانا اس کے لیے قطعی محال تھا۔ جرمنی اور روس کی جنگ میں لوہے اور آگ کا کھیل جس طرح کھیلا گیا ہے، جس سے زیادہ خوفناک کھیل چشمِ فلک نے آج تک نہیں دیکھا، کیا یہ کھیل محض نازیت اور اشتراکیت کے اصولوں کی طاقت سے کھیلا جا سکتا تھا؟ اگر دونوں قوموں کے افراد اس کے لیے کافی اخلاقی طاقت نہ رکھتے ہوتے تو جنگ کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز معاملہ چین کا ہے۔ جاپان کی تنظیم، اس کی تمدنی ترقی، اس کے وسائل اور اس کی صنعتوں کے مقابلہ میں چین کچھ بھی نہیں رکھتا۔ لیکن یہ چینیوں کا عزم اور ان کا صبر و تحمل، اور اپنے قومی نصب العین کے ساتھ ان کا عشق ہے جس کی بدولت وہ ناقابلِ بیان نقصانات اٹھانے کے باوجود سات سال سے جاپان کے مقابلہ میں جمے ہوئے ہیں۔

یہ تو وہ حقیقتیں ہیں جو بالکل سرسری نظر سے آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی جماعتی ضبط اور کوئی اجتماعی نظام اس وقت تک چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ افراد میں اس کے لیے سچی وفاداری موجود نہ ہو اور ان کے اندر وہ اخلاقی صفات نہ پائی جائیں جو اس کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں۔ ایک بہتر سے بہتر نظام بھی ناکام ہو جاتا ہے اگر اس کو چلانے والے افراد کی سیرتیں کمزور ہوں اور ایک غلط سے غلط نظام بھی کامیابی کے ساتھ چل جاتا ہے اگر اس کو چلانے کے لیے مضبوط سیرت کے افراد بہم پہنچ جائیں۔ انفرادی کمزوریاں ہی وہ رخنے پیدا کرتی ہیں جن سے بالآخر مستحکم سے مستحکم اجتماعی نظام ٹوٹ جاتے ہیں۔ افراد کی اخلاقی طاقت نظام کے رخنوں کو بھر سکتی ہے، مگر انفرادی سیرت کے رخنوں کو بھرنا نظام کے بس کا کام نہیں ہے۔ برطانیہ کے جمہوری نظام سے زیادہ ناقص نظام کا شاید تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے دستور میں اتنے شگاف ہیں اور اتنے بڑے بڑے شگاف ہیں کہ ان سے شخصی استبداد کا طوفان ہر وقت پھوٹ نکلنا ممکن ہے۔ لیکن جس چیز کی بدولت مدتہائے دراز سے پارلیمنٹری نظامِ حکومت اس ملک میں چل رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انگریزی قوم کی سیرت اس کی پشت پناہی ہوئی ہے۔ اسی لیے شگافوں اور بڑے بڑے شگافوں کی موجودگی میں بھی کوئی طوفان ان سے سر نہیں نکال سکتا۔ اس نظام کی تقلید بہت سے ملکوں نے کرنی چاہی اور انھوں نے کاغذ پر ان شگافوں کو بھر دیا جو برطانوی دستور میں ان کو نظر آئے مگر کہیں بھی یہ کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا، ہر جگہ انفرادی سیرت کی کمزوریاں اس طوفان کو لے آئیں جس کا در زدہ کاغذی رخنہ بندیوں سے بند کیا گیا تھا۔ اس مثال پر ماضی اور حال کی تاریخ سے بہت سی اور مثالوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جماعتی ضبط اور اجتماعی نظام کا استحکام بجائے خود انفرادی سیرت کے استحکام پر منحصر ہے۔

دنیا میں جو نظام بھی قائم ہوئے اور کامیابی کے ساتھ چلے ہیں ان میں سے کسی نے بھی محض اس چیز پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ افراد میں جماعتی ضبط قائم کریں اور پھر اپنے پسند کردہ اجتماعی نظام کو قوتِ قاہرہ کے ذریعہ سے

زمین پر مسلّط کر دیں۔ بظاہر انکے کاموں میں یہی چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں، اس لیے لوگ اس غلط فہمی میں پڑجاتے ہیں کہ ان کی کامیابیوں کا سارا دار مدار محض پارٹیوں اور فوجوں کے ڈسپلن، سیاسی و معاشی اداروں کی تنظیم اور ایک مضبوط بیوروکریسی کے قیام پر ہے۔ حالانکہ دراصل یہ سارے نظام افراد میں اپنے مناسب حال اخلاق پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور ان کی کامیابی بالکل اس پر منحصر ہے کہ انھیں مسلسل ایسے افراد کی رسد بہم پہنچتی رہے جن کے اخلاق اور جن کی سیرتیں ان نظاموں کے مناسب حال ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تصورِ اخلاق ہمارے تصور سے بالکل مختلف ہو اور ہماری نگاہ میں وہ چیزیں عین بداخلاقی قرار پائیں جو ان کے نزدیک کمالِ اخلاق ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں کہ جو اخلاقیات ان نظاموں کو اپنے بقا و استمرار اور اپنی ترقی و استحکام کے لیے واقعی مطلوب ہیں ان کی تربیت اپنے افراد کو دینے میں یہ کمال درجہ کی سعی کر رہے ہیں اور موجودہ جنگ ایک پیمانہ ہے جس سے ناپ کر برای العین دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اس تربیت میں کتنی سعی کی ہے۔ انھیں دنیا میں جو کام کرنا ہے اس کے لیے پاکیزگی و طہارت کی فی الواقع کوئی ضرورت نہیں ہے، اُس کے لیے عفت، راستبازی، رحم، انصاف، خداترسی اور شرافتِ نفس سرے سے مطلوب ہی نہیں ہیں، اس لیے یہ صفات ان کی اخلاقی تربیت میں کوئی مقام نہیں رکھتیں۔ اسی طرح جن قبائح و شنائع سے اُن کے پیشِ نظر کام میں کوئی قباحت واقع نہیں ہوتی ان سے اپنے افراد کے نفوس کا تزکیہ کرنے کی بھی وہ کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ان کے نظام میں ایک پرلے درجے کا جھوٹا، زانی، شرابی، جواری اور ہمارے نقطۂ نظر سے انتہائی بدکردار آدمی بھی کھپ سکتا ہے کیونکہ ان عیوب کی وجہ سے اس میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔ مگر جو صفات انھیں مطلوب ہیں وہ انھوں نے ایک دو افراد میں نہیں، کروڑوں کی آبادیوں میں اس کمال کے ساتھ پیدا کی ہیں، اور جن صفات سے ان کے کام میں خرابی واقع ہوتی ہے اُن سے دس پانچ کا نہیں کروڑوں انسانوں کا ایسا مکمل تزکیہ کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑے شیوخِ طریقت کو بھی ان پر رشک کرنا چاہیے۔

آج جو قومیں لڑ رہی ہیں ان کی جیب سے کروڑہا کروڑ روپیہ روزانہ نکل رہا ہے اور صریحاً آگ میں جھونکا جا رہا ہے۔

کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ انھوں نے اپنے بے شمار افراد میں انفاقِ مال کا جذبہ پیدا کر دیا ہے؟ ان کے چھوٹے بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ سب نہایت درجہ کی جفاکشی کے ساتھ اس مقصد کی خدمت کر رہے ہیں جسے وہ عزیز رکھتے ہیں اور اس راہ میں ہر قسم کی محرومیاں، نہ صرف اسبابِ عیش سے بلکہ ضروریاتِ زندگی تک سے محرومیاں انھوں نے گوارا کرلی ہیں۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ پورے پورے ملکوں کی آبادیوں کو ایثار و محنت و مشقت، اور حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینے اور اپنے نفس پر قابو پا لینے کی پوری تربیت دے چکے ہیں؟ ان کے شہر کے شہر گولہ باریوں میں تباہ ہو رہے ہیں، ساری ساری عمر کی کمائیاں آن کی آن میں غارت ہو رہی ہیں، ہزاروں آدمی ایک ایک ہوائی حملے میں بے خان ماں ہو رہے ہیں، دکانیں، کارخانے، مکان، گودام سب ہی کچھ جل رہے ہیں، روز روز کے ہوائی حملوں نے ان کی زندگی کو اطمینان سے قطعی محروم کر رکھا ہے، مگر ان کے عزم میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا نہ غنیم کے آگے جھک کر صلح کر لینے کی خواہش ان میں پیدا ہوتی ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنے بچہ بچہ میں صبر، استقلال، تحمل، اور پختگیِ ارادہ کی صفات پیدا کر دی ہیں؟ وہ آئے دن شکستوں کی خبریں سنتے ہیں، جہازوں کے ڈوبنے اور بڑے بڑے علاقے ہاتھ سے نکل جانے کی خبریں سنتے ہیں۔ بڑی بڑی فوجوں کی چڑھائیوں اور دشمن کی ہولناک تیاریوں کی خبریں سنتے ہیں، مگر ان کی ذرا ہمت نہیں ٹوٹتی، بلکہ اپنے مقصد پر ان کا ایمان کچھ اور بڑھ جاتا ہے، سمندِ عزم کو ایک اور تازیانہ لگ جاتا ہے۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ان کی اخلاقی تربیت نے پوری پوری قوموں کو اولو العزم اور بلند حوصلہ بنا دیا ہے؟ ان میں لاکھوں مائیں ہیں جو اپنے عزیز بچوں کو اور لاکھوں بیویاں ہیں جو اپنے محبوب شوہروں کو خود جنگ کی آگ میں جھونک رہی ہیں اور لاکھوں نوجوان ہیں جو جانتے بوجھتے اُن ہوائی، بحری اور برّی لڑائیوں میں جا رہے ہیں جن سے زندہ بچ کر آنے کی کم ہی اُمید ہوتی ہے۔ باوجودیکہ وہ موت کے بعد کسی اور زندگی کے بھی قائل نہیں، مگر پھر بھی وہ اُس راہ میں جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جس کی کامیابیوں کے پھل ان کو نہیں بلکہ دوسروں کو کھانے ہیں۔ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی تربیت نے کروڑوں افراد میں قربانی، شجاعت اور جان بازی کے اوصاف پیدا کر دیے ہیں؟ پھر ان ایجابی صفات کے مقابلہ میں انھوں نے خود غرضی، شحِ نفس، نفاق، غداری، قومی خیانت، جبن و بزدلی، اور ایسی ہی دوسری غیر مطلوب صفات سے

پوری پوری قوموں کے نفوس کا جیسا کچھ تزکیہ کیا ہے وہ ظاہر ہے۔

اگر افراد کی تیاری سے یہ نظام غافل ہوتے اور صرف جماعتوں اور فوجوں کے ڈسپلن اور اجتماعی اداروں کی تنظیم پر قناعت کر لیتے تو کس طرح ممکن تھا کہ جنگ کی اس مصیبت میں جس کی سختیاں ایک ایک فرد تک پہنچ رہی ہیں، یہ قومیں اتنی پامردی دکھاتیں۔

یہاں ان قوموں کی نظیریں پیش کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ہم ان کو اپنے لیے مثال بنانا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں، وہ اس سے بہت فروتر ہیں کہ ہم انھیں مثال قرار دیں، اور انسانیت کبریٰ کے نقطۂ نظر سے ان کے اخلاقیات اتنے ناقص ہیں کہ کوئی مسلمان انھیں مثال قرار دینے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں ان نظائر کو ہم نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ جو لوگ انہی قوموں کو دیکھ کر تنظیم، تنظیم پکارتے ہیں اور ان کے لٹریچر سے متأثر ہو کر اجتماعی فلسفوں پر اپنی تمام توجہات کو مرکوز کر دیتے ہیں انھیں معلوم ہو جائے کہ جن کی مثال سے انھوں نے یہ سبق سیکھے ہیں ان کے ہاں بھی محض تنظیم اور اجتماعی ادارے ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ اصل چیز انفرادی سیرت ہے جس کی چٹان پر سارے نظامات قائم ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ضمناً ہم یہ بات بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جن قوموں نے نظامِ فاسد کا علم بلند کر رکھا ہے اور جن کے مقابلہ میں جدوجہد کر کے ہمیں نظامِ صالح قائم کرنا ہے، ان کی اخلاقی قوتوں کا کیا حال ہے۔

اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقصود بالذات اجتماعی نظام نہیں بلکہ فرد کی تکمیل ذات ہے، اور اجتماعی نظام اُسی کے لیے مطلوب ہے، نیز خدا کے سامنے ایک ایک انسان فرداً فرداً جواب دہ ہے اور اس جواب دہی کے لیے انفرادی سیرت وکردار کی اصلاح بجائے خود ناگزیر ہے۔ لیکن اس بحث کو اگر تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے اور محض ایک صالح نظام کے قیام ہی کو مقصد کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھا جائے تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ جماعتی انضباط اور منظم حرکت اور اور اقامتِ نظامِ صالح کی جدوجہد پر افراد کا تزکیۂ نفس اور مکارمِ اخلاق کی تربیت بہرحال مقدم ہے۔ اس کے بغیر کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کمزور سیرتوں کے افراد کو لے کر کوئی پیش قدمی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کچی اینٹوں سے ایک ایسا بند

تعبیر کیا جائے جس کو حوادث کا سیلاب پہلی ہی ٹکر میں پاش پاش کر کے رکھ دے۔

اپنے مقصد کے لیے انفرادی سیرت و اخلاق کی جو تیاری ہمیں مطلوب ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ہمیں تین پہلوؤں سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) وہ کیا اخلاقی صفات ہیں جو کسی اجتماعی نظام کو قائم کرنے اور مخالف طاقتوں کے مقابلہ میں کامیاب جدوجہد کرنے کے لیے بہرحال ضروری ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی سا اجتماعی نظام ہو۔

(۲) وہ کونسی اخلاقی صفات ہیں جو فاسد نظامات کو مٹا کر ایک صالح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

(۳) وہ کیا تدابیر ہیں جن سے یہ دونوں قسم کی صفات وسیع پیمانہ پر ایک پوری قوم میں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

پہلے دو مسئلوں کے متعلق ہمیں قرآن و حدیث کی تعلیمات کا پورا جائزہ لینا ہوگا تاکہ ہم ان تمام مطلوبہ صفات کا منبع خود اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات میں تلاش کر سکیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ جس خاص نوعیت کا نظام ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اس کی فطرت سے کونسی صفات مناسبت رکھتی ہیں جن سے نفوس کا آراستہ ہونا ضروری ہے، اور کونسی صفات اس سے مناسبت نہیں رکھتیں جن سے نفوس کا تزکیہ ناگزیر ہے۔ رہا آخری مسئلہ تو اس میں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار سے ہدایت حاصل کرنی ہے۔ جس طرح آپ نے پہلے اپنی تمام قوت ایک قوم کو نظام صالح کا علمبردار بنانے پر صرف کی اور اسے اتنا تیار کر دیا کہ وہ تمام دنیا کے فاسد نظامات کو مٹا کر نظام صالح قائم کرنے کے لیے سربکف میدان میں آکھڑی ہوئی اسی طرح آج ہم بھی اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک ایک قوم کو مجموعی حیثیت سے اتنا تیار نہ کرلیں کہ وہ اس مقصد کی راہ میں تن من دھن سے جدوجہد کرنے اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ جن قوموں کے مقابلہ میں ہمیں نظام صالح قائم کرنا ہے ان میں سے ہر ایک نے اپنے نظام فاسد کی محبت میں فنائیت کا مقام حاصل کر لیا ہے اور جو کچھ وہ ان نظاموں کے لیے کر رہی ہیں وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب اگر ہم کمیت اور کیفیت، دونوں میں ان سے زیادہ اعلیٰ درجہ کی اخلاقی صفات ان سے زیادہ وسیع پیمانہ پر اور ان سے زیادہ گہری بنیادوں پر ایک بڑے حصۂ آبادی میں پیدا نہ کریں تو ہمارا ان کے مقابلہ میں کامیاب ہونا محال ہے۔

تفہیم القرآن

(۱۱)

المائدہ

(از رکوع ۱ تا نصف رکوع ۶)

اس سورہ کا نام پندرھویں رکوع کی آیت هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ کے لفظ "مائدہ" سے ماخوذ ہے۔ قرآن کی بیشتر سورتوں کے ناموں کی طرح اس نام کو بھی سورۃ کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ محض دوسری سورتوں سے ممیز کرنے کے لیے اسے علامت کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔

سورۃ کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد سنہ ۶ ہجری کے اواخر یا سنہ ۷ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی القعدہ سنہ ۶ ہجری کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے مگر کفار قریش نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپ کو عمرہ نہ کرنے دیا اور بڑی رد و کد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آئندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو سفر حج کے آداب بتائے جائیں تاکہ آئندہ سال عمرہ کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے، اور دوسری طرف انھیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو عمرہ سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں، اس لیے کہ بہت سے کافر قبیلوں کے حج کا راستہ اسلامی مقبوضات سے گذرتا تھا اور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ جس طرح انھیں زیارت کعبہ سے روکا گیا ہے اسی طرح وہ بھی ان کو روک دیں۔ یہی تقریب ہے اُس تمہیدی تقریر کی جس سے اس سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ آگے چل کر تیرھویں رکوع میں پھر اسی مسئلہ کو چھیڑا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے رکوع سے چودھویں رکوع تک ایک ہی سلسلۂ تقریر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے مضامین اس سورہ میں

ہم کو ملتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی دور کے معلوم ہوتے ہیں۔

بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورۃ ایک ہی خطبہ پر مشتمل ہے جو یک وقت نازل ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اس سورہ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلۂ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

سورۃ آل عمران اور سورۂ نساء کے زمانہ نزول سے اس سورہ کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت بڑا تغیر واقع ہو چکا تھا۔ یا تو وہ وقت تھا کہ جنگ اُحد کے صدمہ نے مسلمانوں کے لیے مدینہ کے قریبی ماحول کو بھی پُر خطر بنا دیا تھا، یا اب یہ وقت آگیا کہ عرب میں اسلام ایک ناقابلِ شکست طاقت نظر آنے لگا اور اسلامی ریاست ایک طرف نجد تک، دوسری طرف حدودِ شام تک، تیسری طرف ساحلِ بحرِ احمر تک، اور چوتھی طرف مکہ کے قریب تک پھیل گئی۔ اُحد میں جو زخم مسلمانوں نے کھایا تھا وہ ان کی ہمتیں توڑنے کے بجائے اُن کے عزم کے لیے ایک اور تازیانہ ثابت ہوا۔ وہ زخمی شیر کی طرح بپھر کر اُٹھے اور تین سال کی مدت میں انھوں نے نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ان کی مسلسل جدوجہد اور سرفروشیوں کا ثمرہ یہ تھا کہ مدینہ کے چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو میل تک تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا۔ مدینہ پر جو یہودی خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اس کا ہمیشہ کے لیے استیصال ہو گیا اور حجاز میں دوسرے مقامات پر بھی جہاں جہاں یہودی آباد تھے، سب مدینہ کی حکومت کے باجگذار بن گئے۔ اسلام کو دبانے کے لیے قریش نے آخری کوشش غزوۂ خندق کے موقع پر کی اور اس میں وہ سخت ناکام ہوئے۔ اس کے بعد اہلِ عرب کو اس امر میں کچھ شک نہ رہا کہ اسلام کی یہ تحریک اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکمرانی عملاً اپنے حدود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و

مسلک یا قانون کو اپنے دائرۂ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔

پھر ان چند برسوں میں اسلامی اصول و نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممیز تھے، تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نماز با جماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا، ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے، اسلامی قوانین، فوجداری اور دیوانی، بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ بن چکے تھے اور اپنی عدالتوں کے ذریعہ سے نافذ کیے جا رہے تھے، لین دین اور خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے، وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا، نکاح اور طلاق کے قوانین، پردۂ شرعی اور استیذان کے احکام، اور زنا و قذف کی حدود نے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ مسلمانوں کی نشست و برخاست، بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے، اور اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ، جن کا اپنا ایک الگ تمدن بن چکا ہے، پھر کبھی ان میں آملیں گے۔

صلح حدیبیہ سے پہلے تک مسلمانوں کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ وہ کفار قریش کے ساتھ ایک مسلسل کشمکش میں اُلجھے ہوئے تھے اور انھیں اپنی دعوت کا دائرہ وسیع کرنے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ اس رکاوٹ کو حدیبیہ کی ظاہری شکست و حقیقی فتح نے دور کر دیا۔ اس سے ان کو نہ صرف یہ کہ اپنی ریاست کے حدود میں امن میسر آ گیا، بلکہ اتنی مہلت بھی مل گئی کہ گرد و پیش کے علاقوں میں اسلام کی دعوت کو لے کر پھیل جائیں۔ چنانچہ اس کا افتتاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران، روم، مصر اور عرب کے بادشاہوں اور رئیسوں کو خطوط لکھ کر کیا اور اس کے ساتھ ہی قبیلوں اور قوموں میں مسلمانوں کے داعی خدا کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بلانے کے لیے پھیل گئے۔

یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سورہ حسب ذیل تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے:

(۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات۔ اس سلسلہ میں سفرِ حج کے آداب مقرر کیے گئے، شعائر اللہ کے احترام اور زائرینِ کعبہ سے عدمِ تعرض کا حکم دیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کے قطعی حدود قائم کیے گئے اور دورِ جاہلیت کی خود ساختہ بندشوں کو توڑ دیا گیا، اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی، وضو اور غسل اور تیمم کے قاعدے مقرر کیے گئے، بغاوت اور فساد اور سرقہ کی سزائیں معین کی گئیں، شراب اور جوئے کو قطعی حرام کر دیا گیا، قسم توڑنے کا کفارہ مقرر کیا گیا اور قانونِ شہادت میں مزید چند دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو نصیحت۔ اب چونکہ مسلمان ایک حکمراں گروہ بن چکے تھے، ان کے ہاتھ میں طاقت تھی جس کا نشہ قوموں کے لیے اکثر گمراہی کا سبب بنتا رہا ہے، مظلومی کا دور خاتمہ پر تھا اور اس سے زیادہ سخت آزمائش کے دور میں وہ قدم رکھ رہے تھے، اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے بار بار نصیحت کی گئی کہ عدل پر قائم رہیں، اپنے پیش رو اہلِ کتاب کی روش سے بچیں، اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے احکام کی پیروی کا جو عہد انھوں نے کیا ہے اس پر ثابت قدم رہیں اور یہود و نصاریٰ کی طرح اس کو توڑ کر اس انجام سے دوچار نہ ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے، اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتابِ الٰہی کے پابند رہیں، اور منافقت کی روش سے اجتناب کریں۔

(۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت۔ یہودیوں کا زور اب ٹوٹ چکا تھا اور شمالی عرب کی تقریباً تمام یہودی بستیاں مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گئی تھیں۔ اس موقع پر ان کو ایک بار پھر ان کے غلط رویہ پر تنبیہ کیا گیا ہے اور انھیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز چونکہ صلح حدیبیہ کی وجہ سے عرب اور متصل ممالک کی قوموں میں اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع نکل آیا تھا اس لیے عیسائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ خطاب کر کے ان کے عقائد کی غلطیاں بتائی گئی ہیں اور انھیں نبی عربی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ہمسایہ ممالک میں جو قومیں بت پرست یا مجوسی تھیں ان کو براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا، کیونکہ ان کی ہدایت کے لیے وہ خطبات کافی تھے جو ان کے ہم مسلک مشرکینِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے نازل ہوئے تھے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

۱ اے ایمان لانے والو! بندشوں کی پوری پابندی کرو۔[۱] تمھارے لیے مویشی کی قسم کے سب جانور حلال کیے گئے[۲]
سوائے اُن کے جو آگے چل کر تم کو بتائے جائیں گے، لیکن احرام کی حالت میں شکار کو اپنے لیے حلال نہ کر لو۔[۳] بے شک
اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔[۴] ۲ اے ایمان لانے والو! خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو[۵] ــــــ نہ حرام

---

[۱] یعنی ان حدود اور قیود کی پابندی کرو جو اس سورہ میں تم پر عائد کی جا رہی ہیں، اور جو بالعموم خدا کی شریعت میں تم پر عائد کی گئی ہیں۔ اس مختصر سے تمہیدی جملے کے بعد ہی اُن بندشوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے جن کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

[۲] "اَنعام" (مویشی)، کا لفظ عربی زبان میں اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری پر بولا جاتا ہے، اور "بہیمہ" کا اطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ "انعام" تمھارے لیے حلال کیے گئے، تو اس سے صرف وہی چار جانور حلال ہوتے جنھیں عرب میں "انعام" کہتے ہیں۔ لیکن حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ "مویشی کی قسم کے چرندہ چوپائے تم پر حلال کیے گئے"۔ اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندہ جانور اس کے دائرے میں آ جاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں، یعنی جو کچلیاں نہ رکھتے ہوں، حیوانی غذا کے بجائے نباتی غذا کھاتے ہوں اور دوسری حیوانی خصوصیات میں انعامِ عرب سے مماثلت رکھتے ہوں۔

حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا گوشت کھایا جا سکتا ہے، دودھ پیا جا سکتا ہے، ان کی کھال اور اون اور بال، سب چیزیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔

[۳] "احرام" اُس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارتِ کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلہ پر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں جب تک کہ وہ اپنا معمولی لباس اُتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہبند ہوتا ہے اور ایک چادر جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے۔ اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے باندھنے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں، مثلاً حجامت، خوشبو کا استعمال، ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضاءِ شہوت وغیرہ۔ انہی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کیا جائے اور نہ شکار کھیلا جائے۔

[۴] یعنی اللہ حاکمِ مطلق ہے۔ اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے۔ بندوں کو اس کے احکام میں چون و چرا (باقی اگلے صفحہ پر)

مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں، نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں ۵ ۔ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو ۶......

(بقیہ سابق) کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں لیکن بندۂ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مصلحت سمجھتا ہے بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ مالک کا حکم یہی ہے۔ جو چیز اس نے حرام کر دی ہے وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے، اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ اشیاء کی حرمت و حلت کے لیے مالک کی اجازت و عدمِ اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً ضرورت نہیں، اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خدا جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز۔

۵ ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرزِ فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا "شعار" کہلائے گی کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ حکومتوں کے جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ ان کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں، چوٹی اور زنّار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں، کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں، ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہے، سواستیکا نازیت کا شعار ہے، یہ سب مسلک اپنے پیرووں سے اپنے شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے بغاوت کا ہم معنی ہے۔

"شعائر اللہ" سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی (باقی اگلے صفحہ پر)

اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمھارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمھارا غصہ تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔[سلہ] نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون

(بقیہ سابق) کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں۔ ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیل کی آلودگی سے انھیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اگر اپنے عقیدہ وعمل میں خدائے واحد کی بندگی وعبادت کا کوئی جزء رکھتا ہے تو اس جزء کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور اس کے مذہب میں جو شعائر خالص خدا پرستی کی علامت ہوں ان کا پورا احترام ملحوظ رکھیں گے۔ اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اگر ہے تو اس امر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اُس زمانہ میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں اور مشرکین عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکہ پر مشرکین قابض تھے، عرب کے ہر حصے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبہ کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اُس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمھارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انھیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لیے جو جانور یہ لیے جا رہے ہوں ان پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصہ باقی ہے وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

(حواشی صفحہ ۱۹۰) سلہ "شعائر اللہ" کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا کیونکہ اُس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔ ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔

سلہ احرام بھی من جملہ شعائر اللہ ہے، اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے، اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شعار کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کرو اور جو گناہ کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

تم پر حرام کیا گیا مردار[1]، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو[2]، وہ جو گلا گھُٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو[3] ــــ سوائے اُس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا[4] ــــ اور وہ جو کسی آستانے[5] پر ذبح کیا گیا ہو[6]۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں

(بقیہ سابق) توہین کرنا ہے، البتہ جب شرعی قاعدہ کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۹۱) [1] چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو کعبہ کی زیارت سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیے گئے تھے اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گذرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانۂ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انھیں اس ارادے سے باز رکھا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [1] یعنی وہ جانور جو طبعی موت مر گیا ہو۔

[2] یعنی جس کو ذبح کرتے وقت خدا کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، یا جس کو ذبح کرنے سے پہلے یہ نیت کی گئی ہو کہ یہ فلاں بزرگ یا فلاں دیوی یا دیوتا کی نذر ہے۔ اس مضمون پر مفصل نوٹ سورۂ بقرہ رکوع ۲۱ میں گذر چکا ہے۔

[3] درندے کا پھاڑا ہوا جانور ہی حرام نہیں بلکہ درندہ خود بھی حرام ہے۔ چنانچہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام جانور حرام ہیں جو کچلیاں اور پنجے رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں۔

[4] یعنی جو جانور گلا گھُٹ جانے یا چوٹ لگنے، یا گرنے یا ٹکر کھانے یا درندے کے پھاڑنے سے مرا نہ ہو بلکہ کچھ آثار زندگی اس میں پائے جاتے ہوں اُس کو اگر ذبح کر لیا جائے تو اُسے کھایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حلال جانور کا گوشت صرف ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس کو ہلاک کرنے کا صحیح نہیں ہے۔ "ذبح" اور "ذکاۃ" اسلام کے اصطلاحی لفظ ہیں۔ ان سے مراد حلق کا اتنا حصہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے۔ جھٹکا کرنے یا گلا گھونٹنے یا اور کسی تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خون کا بیشتر حصہ جسم کے اندر ہی رُک کر رہ جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ برعکس اس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کے ساتھ جسم کا تعلق دیر تک باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے رگ رگ کا خون کھنچ کر باہر آجاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت خون سے صاف ہو جاتا ہے۔

؎ اصل میں لفظ نصب استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو۔ خواہ وہاں کوئی پتھر کی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔

؎ یہ چیزیں جن کے کھانے کو حرام کیا گیا ہے، ان کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام و حلال کی جو قیود شریعت کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں ان کی اصل بنیاد ان اشیاء کے طبی فوائد یا نقصانات نہیں ہو[illegible] معنوی فوائد و نقصانات ہوتے ہیں۔ جہاں تک طبیعی امور کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی اپنی سعی و جستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادی اشیاء میں سے کیا چیزیں اس کے جسم کو غذاء صالح بہم پہنچانے والی ہیں اور کیا چیزیں تغذیہ کے لیے غیر مفید یا نقصان دہ ہیں۔ شریعت ان امور میں اس کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ البتہ یہ امر کہ کونسی غذاؤں کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر ہوتا ہے، اور کونسی غذائیں طہارت نفس کے لحاظ سے کیسی ہیں، اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں سے کونسے طریقے اعتقادی و نظری حیثیت سے صحیح یا غلط ہیں، اس کی تحقیق کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے، کیونکہ اس کے ذرائع انسان کو میسر نہیں، اور اسی بنا پر انسان نے اکثر ان امور میں غلطیاں کی ہیں، اس لیے شریعت صرف انہی امور میں انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے انہیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا برا اثر پڑتا ہے، یا وہ طہارت کے خلاف ہیں، یا ان کا تعلق کسی فاسد عقیدہ سے ہے۔ برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان برائیوں میں سے کوئی برائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں میں ہم زیادہ سے زیادہ مجملاً ہی یہ جان سکتے ہیں کہ ان میں کیا خرابی ہے، مگر تفصیل کے ساتھ ان کی خرابیوں کو جاننا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ بات کہ خون، یا سور کے گوشت یا مردار کے کھانے سے ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رونما ہوتی ہیں، کس قدر اور کس طرح ہوتی ہیں، اس کی تحقیق ہمارے لیے غیر ممکن ہے کیونکہ اخلاق کو ناپنے اور تولنے کے ذرائع ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بالفرض ان اثرات کو بیان کر بھی دیا جاتا تو شبہ کرنے والا (باقی اگلے صفحہ پر)

کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو[1]۔ یہ سب افعال فسق ہیں[2]۔ آج[3] کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو[4]۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے[5] (لہٰذا حرام و

(بقیہ سابق) تقریباً اسی مقام پر ہوتا جس مقام پر وہ اب ہے، کیونکہ وہ اس بیان کی صحت و عدم صحت کو آخر کس چیز سے جانچتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حرام و حلال کے حدود کی پابندی کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے۔ جو شخص اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب اللہ کی کتاب ہے اور رسول اللہ کا رسول ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرے گا، خواہ ان کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جن چیزوں کی خرابیاں انسانی علم کے احاطہ میں آگئی ہیں صرف انہی سے پرہیز کرے اور جن کی خرابیوں کا علمی احاطہ نہیں ہو سکا ہے ان کے نقصانات کا تختۂ مشق بنتا رہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ جامع ہدایت ہے۔ پانسوں کی تعریف میں قرعہ اندازی کے تمام وہ طریقے آجاتے ہیں جو محض بخت و اتفاق پر مبنی ہوں، حتیٰ کہ گھوڑ دوڑ، لاٹری اور فال اور رمل بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔ پھر "قسمت معلوم کرنے" کا مفہوم بھی وسیع ہے۔ کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کسی مال کی تقسیم مطلوب ہو، یا لین دین کے معاملات ہوں، ان سب امور میں مذکورۂ بالا طریقوں سے فیصلہ کرنا حرام ہے۔

[2] فسق = خدا کی نافرمانی، اطاعت سے نکل جانا، قانون سے باہر ہونا۔

[3] "آج" سے مراد کوئی خاص دن اور تاریخ نہیں بلکہ وہ دور یا زمانہ ہے جس میں کلام کیا جا رہا ہو۔ ہماری زبان میں بھی آج کا لفظ زمانۂ حال کے لیے عام طور پر بولا جاتا ہے۔

"کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے"، یعنی اب تمہارا دین ایک مستقل نظام بن چکا ہے اور خود اپنی حاکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ و قائم ہے۔ کافر، جو اب تک اس کے قیام میں مانع و مزاحم رہے ہیں، انھیں اب کوئی امید نہیں رہی کہ وہ اسے مٹا سکیں گے اور تمھیں پھر پچھلی جاہلیت کی طرف واپس لے جا سکیں گے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

حلال کی جو قیود تم پر عائد کر دی گئی ہیں ان کی پابندی کرو) ۔ البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہو کر ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[14]۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے، کہو تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں[15]۔ اور

(بقیہ سابق) "لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو" یعنی اس دین کے احکام اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں اب کسی کافر طاقت کے غلبہ و قہر اور دست اندازی و مزاحمت کا خطرہ تمہارے لیے باقی نہیں رہا ہے ۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی ۔ اب تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوئی کوتاہی تم نے کی تو تمہارے پاس کوئی عذر نہ ہوگا جس کی بنا پر تمہارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جائے۔

[13] دین کو مکمل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظام فکر و عمل اور ایک مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے ۔ نعمت تمام کرنے سے مراد نعمت ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے ۔ اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت و بندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا اس کو چونکہ تم اپنی سعی و عمل سے سچا اور مخلصانہ اقرار ثابت کر چکے ہو اس لیے میں نے اسے درجۂ قبولیت عطا فرمایا ہے اور تمہیں عملاً اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت و بندگی کا جوا تمہاری گردنوں پر باقی نہیں رہا ۔ اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے مسلم ہو اسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مسلم بن کر رہنے کے لیے کوئی مجبوری تمہیں لاحق نہیں رہی ہے ۔ ان احسانات کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ سکوت اختیار فرماتا ہے مگر انداز کلام سے خود بخود یہ بات نکل آتی ہے کہ جب یہ احسانات میں نے تم پر کیے ہیں تو ان کا تقاضا یہ ہے کہ اب میرے قانون کی حدود پر قائم رہنے میں تمہاری طرف سے بھی کوئی کوتاہی نہ ہو۔

مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ھ ہجری میں نازل ہوئی تھی لیکن جس سلسلۂ کلام میں یہ واقع ہوئی ہے وہ صلح حدیبیہ سے متصل زمانہ (۶ھ) کا ہے اور سیاق عبارت میں دونوں فقرے کچھ ایسے پیوستہ نظر آتے ہیں کہ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ ابتداء میں یہ سلسلۂ کلام ان فقروں کے بغیر نازل ہوا تھا اور بعد میں جب یہ نازل ہوئے تو انہیں یہاں لا کر نصب کر دیا گیا ۔ میرا قیاس یہ ہے ۔ والعلم عند اللہ ، کہ ابتداءً یہ آیت اسی سیاق کلام میں نازل ہوئی تھی اس لیے اس کی حقیقی اہمیت لوگ نہ سمجھ سکے ، (باقی اگلے صفحہ پر)

جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو ـــــ جن کو خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو ـــــ وہ جس جانور کو تمھارے لیے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو[۱] ، البتہ اس پر اللہ کا نام لے لو[۲] ، اور اللہ کا

(بقیہ سابق) بعد میں جب تمام عرب مسخر ہو گیا اور اسلام کی طاقت اپنے شباب پر پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہ فقرے اپنے نبی پر نازل فرمائے اور ان کے اعلان کا حکم دیا۔

(حاشیہ صفحہ ۱۹۵) [۱] اس مضمون کی تفصیل سورہ بقرہ رکوع ۲۱ میں گذر چکی ہے۔

[۲] اس جواب میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ مذہبی طرز خیال کے لوگ اکثر اس ذہنیت کے شکار ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں جب تک کہ صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جائے۔ اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر وہمی پن اور قانونیت کا تسلط ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں حلال اشیاء اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں اور ہر کام اور ہر چیز کو اس شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ ممنوع تو نہیں۔ یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔ پوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انھیں تمام حلال چیزوں کی تفصیل بتائی جائے تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل اُلٹ گیا۔ قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے بجز اُس کے جسے حلال ٹھیرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے بجز اُس کے جس کی حرمت کی تصریح کر دی جائے۔ یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو بندشوں سے آزاد کر کے دنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے حلت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے سوا ساری دنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مستثنیٰ کر کے ساری دنیا اس کے لیے حلال ہو گئی۔

حلال کے لیے "پاک" کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس عام اباحت کی دلیل سے حلال ٹھیرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اشیاء کے "پاک" ہونے کا تعین کس طرح ہوگا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اصولِ شرع میں سے کسی اصل کے ماتحت ناپاک قرار پائیں، یا جن چیزوں سے ذوقِ سلیم کراہت کرے، یا جنھیں مہذب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساسِ نظافت کے خلاف پایا ہو، ان کے ماسوا سب کچھ پاک ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

قانون توڑنے سے ڈرو، اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

(حواشی صفحہ ۱۹۶) ۱؎ شکاری جانوروں سے مراد کتے، چیتے، باز، شکرے اور تمام وہ درندے اور پرندے ہیں جن سے انسان شکار کی خدمت لیتا ہے۔ سدھائے ہوئے جانور کا خاصہ یہ ہے کہ وہ عام درندوں کی طرح جس چیز کا شکار کرتا ہے اسے پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سدھائے ہوئے درندوں کا شکار حلال۔

اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان کچھ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر شکاری جانور نے، خواہ وہ درندہ ہو یا پرندہ، شکار میں سے کچھ کھا لیا تو وہ حرام ہوگا کیونکہ اس کا کھا لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نے شکار کو مالک کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا، یہی مسلک امام شافعی کا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تب بھی وہ حرام نہیں ہوتا حتیٰ کہ اگر ایک تہائی حصہ بھی وہ کھا لے تو بقیہ دو تہائی حلال ہے، اور اس معاملہ میں درندے اور پرندے کے درمیان کچھ فرق نہیں۔ یہ مسلک امام مالک کا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ شکاری درندے نے اگر شکار میں سے کھایا ہو تو وہ حرام ہوگا لیکن اگر شکاری پرندے نے کھایا ہو تو حرام نہ ہوگا۔ کیونکہ شکاری درندے کو ایسی تعلیم دی جا سکتی ہے کہ وہ شکار کو مالک کے لیے پکڑ رکھے اور اس میں سے کچھ نہ کھائے، لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ شکاری پرندہ ایسی تعلیم قبول نہیں کرتا۔ یہ مسلک امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شکاری پرندے کا شکار سرے سے جائز ہی نہیں ہے، کیونکہ اسے تعلیم سے یہ بات نہیں سکھائی جا سکتی کہ شکار کو خود نہ کھائے بلکہ مالک کے لیے پکڑ رکھے۔

۲؎ یعنی شکار کو جانور پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آیا میں کتے کے ذریعہ سے شکار کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ "اگر اس کو چھوڑتے ہوئے تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھاؤ ورنہ نہیں۔ اور اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا ہو تو نہ کھاؤ کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لیے پکڑا"۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اگر میں شکار پر اپنا کتا چھوڑوں اور بعد میں دیکھوں کہ کوئی اور کتا وہاں موجود ہے؟ آپ نے جواب دیا "اس شکار کو نہ کھاؤ۔ اس لیے کہ تم نے خدا کا نام اپنے کتے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کتے پر"۔

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے ہوئے خدا کا نام لینا ضروری ہے۔ اس کے بعد (باقی اگلے صفحہ پر)

آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے[1]۔ اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ سے ہوں یا اُن قوموں میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی[2]، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے نکاح میں اُن کے

(بقیہ سابق) اگر شکار زندہ ملے تو پھر خدا کا نام لے کر اسے ذبح کر لینا چاہیے اور اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی وہ حلال ہوگا کیونکہ ابتداءً شکاری جانور کو اس پر چھوڑتے ہوئے مالک کا نام لیا جا چکا تھا۔ یہی حکم تیر اور بندوق کا بھی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اہل کتاب کے کھانے میں ان کا ذبیحہ بھی شامل ہے۔ ہمارے لیے ان کا اور ان کے لیے ہمارا کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ نہیں، جس طرح ہم ان کا کھانا کھا سکتے ہیں اسی طرح اپنا کھانا انھیں کھلا بھی سکتے ہیں۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرما دیا گیا ہے کہ "تمھارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب اگر پاکی وطہارت کے اُن قوانین کی پابندی نہ کریں جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، یا اگر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں، یا اس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام لیں، تو اسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں۔ اسی طرح اگر ان کے دسترخوان پر شراب یا سور یا کوئی اور حرام چیز ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہل کتاب ہی کا جائز ہے جبکہ انھوں نے خدا کا نام اس پر لیا ہو، رہے غیر اہل کتاب تو ان کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔

[2] اہل کتاب سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں اور نکاح کی اجازت صرف انہی کی عورتوں سے دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ وہ محصنات (محفوظ عورتیں) ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ابن عباس کا خیال ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد صرف ذمی اہل کتاب ہیں، اسلامی حکومت سے باہر جو یہودی اور نصرانی آباد ہوں ان کی عورتوں سے نکاح درست نہیں۔ حنفیہ اس سے تھوڑا اختلاف کرتے ہیں، ان کے نزدیک غیر ذمی اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح حرام تو نہیں مگر مکروہ ضرور ہے۔ بخلاف اس کے سعید ابن المسیب اور حسن بصری اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے (باقی اگلے صفحہ پر)

محافظ بنو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔ اور جو کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی ضائع ہوجائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا۔[ا]

اے ایمان لانے والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھو لو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔[۲] اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہوجاؤ۔[۳] اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو، بس اُس پر ہاتھ مار کر اپنے منہ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو۔[۴] اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا

(بقیہ سابق) حکم میں عام ہے لہٰذا ذمی اور غیر ذمی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں، پھر محصنات کے مفہوم میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمر کے نزدیک اس سے مراد پاک دامن، عصمت مآب عورتیں ہیں اور اس بنا پر وہ آوارہ عورتوں کو اس اجازت سے خارج قرار دیتے ہیں۔ یہی رائے حسن، شعبی اور ابراہیم نخعی کی ہے اور حنفیہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ بخلاف اس کے امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد آزاد عورتیں ہیں اور یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔

(حاشی صفحہ ہذا) [۱] اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دینے کے بعد یہ فقرہ اس لیے تنبیہ کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اس اجازت سے فائدہ اٹھائے وہ اپنے ایمان و اخلاق کی طرف سے ہشیار رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر بیوی کے عشق میں مبتلا ہو کر یا اس کے عقائد اور اعمال سے متاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔

[۲] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ کے دھونے میں کلی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے، بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکمیل نہیں ہوتی، اور سر کے مسح میں کانوں کے اندرونی و بیرونی حصوں کا مسح بھی شامل ہے، نیز وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہییں تاکہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہو وہ خود پہلے پاک ہوجائیں۔

[۳] جنابت خواہ وہ اس وجہ سے لاحق ہوئی ہو کہ خواب میں مادۂ منویہ خارج ہوجائے، یا اس وجہ سے کہ فعل زوجیت کا ارتکاب کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں غسل واجب ہے۔ اس حالت میں غسل کے بغیر نماز پڑھنا یا قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مگر وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے[۱]، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے[۲] اُس کا خیال رکھو اور اُس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمھارا یہ قول کہ "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی"۔ اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے، انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کرے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ نہیں، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی خطاؤں سے درگذر کیا جائے گا اور انھیں بڑا اجر ملے گا۔ رہے وہ لوگ جو کفر کریں اور اللہ کی آیات کو جھٹلائیں، تو وہ دوزخ کے رفیق ہیں۔

اے ایمان لانے والو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے (ابھی حال میں) تم پر کیا ہے، جبکہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر اٹھنے سے روک دیے[۳]۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، ایمان رکھنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ع ۲

(بقیہ سابق) ؎ اس حکم کی تشریح سورۂ نساء رکوع ۷ میں گذر چکی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎۱ جس طرح پاکیزگیٔ نفس ایک نعمت ہے اسی طرح پاکیزگیٔ جسم بھی ایک نعمت ہے۔ انسان پر اللہ کی نعمت اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جبکہ نفس و جسم دونوں کی طہارت و پاکیزگی کے لیے پوری ہدایت اسے مل جائے۔

؎۲ یعنی یہ نعمت کہ زندگی کی شاہراہ مستقیم تمھارے لیے روشن کر دی اور دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے منصب پر تمھیں سرفراز کیا۔

؎۳ اشارہ ہے اُس واقعہ کی طرف جسے حضرت عبداللہ ابن عباس نے روایت کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک گروہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاص خاص صحابہ کو کھانے کی دعوت پر بلایا تھا اور خفیہ طور پر یہ سازش کی تھی کہ اچانک ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس طرح اسلام کی جان نکال دیں گے۔ لیکن عین وقت پر اللہ کے فضل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا اور آپ دعوت پر تشریف نہ لے گئے۔ چونکہ یہاں سے خطاب کا رُخ بنی اسرائیل کی طرف پھر رہا ہے اس لیے تمہید کے طور پر (باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے[۲] اور ان سے کہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی[۳] اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے[۴] تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا

(بقیہ سابق) اس واقعہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اس تقریر کے دو مقصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس روش پر چلنے سے روکا جائے جس پر ان کے پیش رو اہل کتاب چل رہے تھے۔ چنانچہ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح آج تم سے عہد لیا گیا ہے اسی طرح کل یہی عہد بنی اسرائیل سے اور مسیح علیہ السلام کی امت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح وہ اپنے عہد کو توڑ کر گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اسی طرح تم بھی اسے توڑ دو اور گمراہ ہو جاؤ۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے اور دین حق کی طرف دعوت دی جائے۔

[۲] نقیب کے معنی نگرانی اور تفتیش کرنے والے کے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر قبیلہ پر ایک ایک نقیب خود اسی قبیلہ سے مقرر کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھے اور انھیں بے دینی و بد اخلاقی سے بچانے کی کوشش کرتا رہے۔ بائیبل کی کتاب گنتی میں بارہ "سرداروں" کا ذکر موجود ہے، مگر ان کی وہ حیثیت جو یہاں لفظ "نقیب" سے قرآن نے بیان کی ہے، بائیبل کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بائیبل انھیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور قرآن ان کی حیثیت نقیب کی قرار دیتا ہے۔

[۳] یعنی جو رسول بھی میری طرف سے آئیں، ان کی دعوت پر تم لبیک کہتے اور ان کی مدد کرتے رہے۔

[۴] یعنی خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے رہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اُس ایک ایک پائی کو جو انسان اس کی راہ میں خرچ کرے، کئی گنے زیادہ انعام کے ساتھ واپس کرنے کا وعدہ فرماتا ہے اس لیے قرآن میں جگہ جگہ راہ خدا میں مال خرچ کرنے کو "قرض" سے تعبیر کیا گیا ہے، بشرطیکہ وہ "اچھا قرض" ہو، یعنی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت خرچ کی جائے، خدا کے قانون کے مطابق خرچ کی جائے اور خلوص و حسن نیت کے ساتھ خرچ کی جائے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

26

جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، مگر اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی تو درحقیقت اس نے سواءالسبیل[ل]

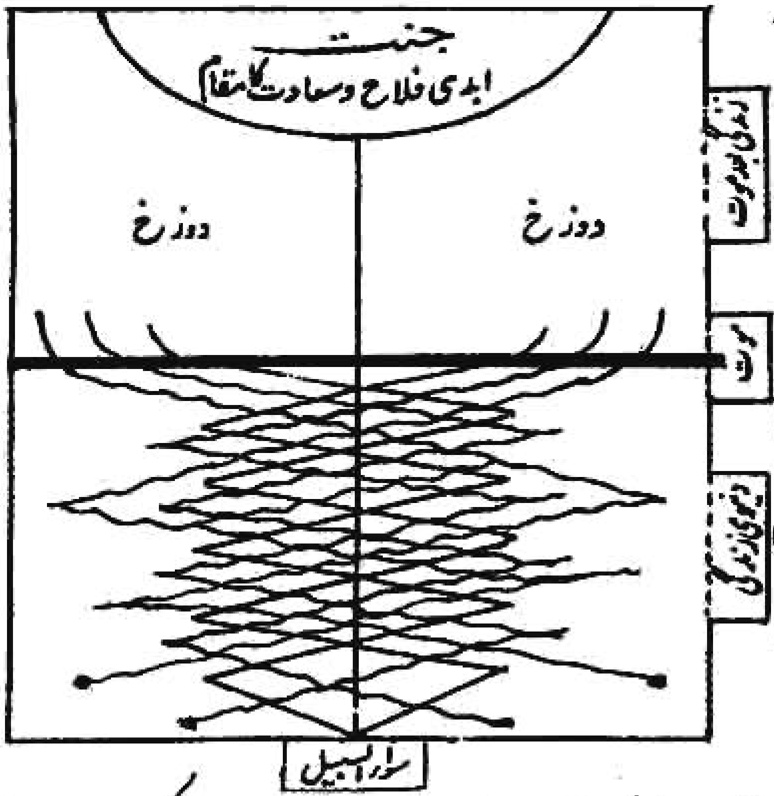
(بقیہ سابق) ؎ کسی سے اس کی برائیاں زائل کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ راہِ راست کو اختیار کرنے اور خدا کی ہدایت کے مطابق فکر و عمل کے صحیح طریقے پر چلنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا نفس بہت سی برائیوں سے اور اس کا طرزِ زندگی بہت سی خرابیوں سے پاک ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس اصلاح کے باوجود اگر کوئی شخص بحیثیتِ مجموعی کمال کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے اور کچھ نہ کچھ برائیاں اس کے اندر باقی رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان پر مواخذہ نہ فرمائے گا اور ان کو اس کے حساب سے ساقط کر دے گا، کیونکہ جس نے اساسی ہدایت اور بنیادی اصلاح قبول کر لی ہو اس کی جزئی اور ضمنی برائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎ یعنی "سواء السبیل" کو پا کر اسے پھر کھو دیا اور تباہی کے راستوں میں بھٹک نکلا۔ "سواء السبیل" کا ترجمہ توسط و اعتدال کی شاہ راہ کیا جا سکتا ہے مگر اس سے پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ کی معنویت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان ایک عالمِ اصغر ہے جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں ہیں، خواہشیں ہیں، جذبات اور رجحانات ہیں، نفس اور جسم کے مختلف مطالبے ہیں، روح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں۔ پھر انسان کی اجتماعی زندگی بے حد و حساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہے اور تمدن و تہذیب کے نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے مجموعۂ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا لہٰذا انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو، اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم رہے، اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں، اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے، اور مادی اشیاء کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل، انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو، (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ سابق)، زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلط ہوجاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلاارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے، اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ مجبوراً بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حدود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو۔ مگر انصاف پھر بھی نہیں ہوتا، کیونکہ پھر وہی عمل رونما ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک، جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا، انسانی دماغ پر حاوی ہوجاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضیات کے مطابق ایک خاص رُخ پر بہا لے جاتا ہے جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا، ہمیشہ وہ جھکولے کھاتی اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی رہتی ہے۔ تمام راستے جن پر خود انسان اپنی زندگی کو چلاتا رہا ہے بخطِ منحنی کی شکل میں واقع ہیں، غلط سمت سے چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ ان بہت سے ٹیڑھے اور غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ، اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ، اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی بھی، کسی پہلو کی بیجا رعایت اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقا، اور اس کی کامیابی و بامرادی کے لیے سخت ضروری ہے، اس کی عین فطرت اس راہ کی طالب ہے، اور مختلف ٹیڑھے راستوں سے بار بار اس کے بغاوت کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس سیدھی شاہ راہ کو ڈھونڈتی ہے۔ مگر انسان خود اس شاہ راہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں، اس کی طرف صرف خدا راہ نمائی کر سکتا ہے اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے بھیجے ہیں کہ اس راہِ راست کی طرف انسان کی رہنمائی کریں۔ قرآن اسی راہ کو سواء السبیل کہتا ہے۔ یہ سواء السبیل دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے سیدھی گذرتی چلی جاتی ہے۔ جو اس پر چلا، وہ یہاں راست رَو اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے، (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ سابق) اور جس نے اس راہ کو گم کر دیا، وہ یہاں غلط بیں، غلط رو اور غلط کار ہے اور آخرت میں لامحالہ اسے دوزخ میں جانا ہے کیونکہ زندگی کے تمام ٹیڑھے راستے دوزخ ہی کی طرف جاتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے درپے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جارہی ہے، یہ غلط نتیجہ نکال لیا کہ "جدلی عمل" (Dialectical process) انسانی زندگی کے ارتقار کا فطری طریق ہے۔ وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقار کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعویٰ (Thesis) اُسے ایک رخ پر بہالے جائے، پھر اس کے جواب میں دوسرا ویسا ہی انتہا پسندانہ دعویٰ (Antithesis) اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے اور پھر دونوں کے امتزاج (Synthesis) سے ارتقار حیات کا راستہ بنے۔ حالانکہ دراصل یہ ارتقار کی راہ نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح



ارتقار میں باربار مانع ہو رہے ہیں۔ ہر انتہا پسندانہ دعویٰ زندگی کو اس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اُسے کھینچے لیے چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ سواء السبیل سے بہت دور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دوسری حقیقتیں جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی، اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوے کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کرتی ہے۔ جوں جوں سواء السبیل قریب آتی ہے ان متصادم دعووں کے درمیان مصالحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں، لیکن جب وہاں نہ سواء السبیل کے نشانات دکھانے والی روشنی موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان، تو وہ جوابی دعویٰ زندگی کو اس مقام پر ٹھیرنے نہیں دیتا بلکہ اپنے زور میں اُسے دوسری جانب انتہا تک کھینچتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

گم کردی"۔ پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، جو تعلیم انھیں دی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں، اور آئے دن تمھیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں۔ (پس جب یہ اس حال کو پہنچ چکے ہیں تو جو شرارتیں بھی یہ کریں وہ ان سے عین متوقع ہیں)، لہٰذا انھیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں۔

اسی طرح ہم نے اُن لوگوں سے بھی پختہ عہد لیا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ ہم "نصاریٰ" ہیں[۱]، مگر ان کو بھی جو سبق یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انھوں نے فراموش کر دیا، آخر کار ہم نے ان کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دشمنی اور آپس کے بغض وعناد کا بیج بو دیا، اور ضرور ایک وقت آئے گا جب اللہ انھیں بتائے گا کہ وہ دنیا میں کیا بناتے رہے ہیں۔ اے اہل کتاب! ہمارا رسول تمھارے پاس آگیا ہے جو کتاب الٰہی کی بہت سی ان باتوں کو تمھارے سامنے کھول رہا ہے جن پر تم پردہ ڈالا کرتے تھے، اور بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتا ہے[۲]۔ تمھارے پاس اللہ کی طرف

(بقیہ سابق) اور نتیجہ میں ایک دوسری بغاوت اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انھوں نے سواء السبیل کو دیکھ لیا ہوتا تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے لیے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی سواء السبیل ہے نہ کہ خط منحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یہ خیال غلط ہے کہ "نصاریٰ" کا لفظ "ناصرہ" سے ماخوذ ہے جو مسیح علیہ السلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ أَنْصَارِيْ إِلَى اللّٰهِ (خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں)۔ عیسائی مصنفین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناصریہ (Nazarenes) کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا اور جنھیں حقارت کے ساتھ ناصری اور ابیونی کہا جاتا تھا، انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں قرآن (باقی اگلے صفحہ پر)

سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے[۱] اور اپنے اذن سے اُن کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے میں لاتا ہے اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ مسیح ابنِ مریم ہی خدا ہے[۲]۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین اور آسمانوں کا اور ان سب چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے[۳] اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

(بقیہ سابق) صاف کہہ رہا ہے کہ انھوں نے خود کہا تھا کہ ہم "نصاریٰ" ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے اپنا نام کبھی ناصری نہیں رکھا۔

[۱] یعنی تمھاری بعض چوریاں اور خیانتیں کھول دیتا ہے جن کا کھولنا دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے، اور بعض سے چشم پوشی اختیار کر لیتا ہے جن کے کھولنے کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] "سلامتی" سے مراد غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے۔ جو شخص اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی زندگی سے روشنی حاصل کرتا ہے اسے فکر و عمل کے ہر چوراہے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ رہے۔

[۲] عیسائیوں نے ابتداءً مسیح کی شخصیت کو انسانیت اور الوہیت کا مرکب قرار دے کر جو غلطی کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے مسیح کی حقیقت ایک معما بن کر رہ گئی جسے ان کے علماء نے لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی اور الجھتے چلے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر مسیح کی مرکب شخصیت کے جزوِ انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کے ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور جس کے ذہن پر جزوِ الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے ہی کی حیثیت سے مسیح کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنھوں نے نکالنی چاہی انھوں نے سارا زور ایسی لفظی تعبیریں فراہم کرنے پر صرف کر دیا جن سے مسیح کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ (باقی اگلے صفحہ پر)

یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو، پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمھیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے، زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی مِلک ہیں، اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔

اے اہلِ کتاب! ہمارا یہ رسول ایسے وقت تمہارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح تعلیم تمھیں دے رہا ہے جبکہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ سو دیکھو! اب وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آگیا ـــــ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۱]۔ ع

یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اُس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمھیں عطا کی تھی۔ اُس نے تم میں نبی پیدا کیے، تم کو فرماں روا بنایا، اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا[۲]۔ اے

(بقیہ سابق) خدا بھی کہا جاسکے، خدا اور مسیح الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔

سلّہ اس فقرے میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیح کی اعجازی پیدائش اور ان کے اخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکے میں پڑ گئے کہ مسیح ہی خدا ہے وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیح تو اللہ کے بے شمار عجائب تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چوندھیا گئیں۔ اگر ان لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انھیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے۔ پس یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو مخلوق کے کمالات میں خالق کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور حاصل کرتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) لہ اس موقع پر یہ فقرہ نہایت بلیغ و لطیف ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خدا پہلے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بھیجنے پر قادر تھا اسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خدمت پر مامور کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر قادر تھا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس بشیر و نذیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو کہ اللہ قادر و توانا ہے، ہر سزا جو وہ تمھیں دینا چاہے بلا مزاحمت دے سکتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے[1]، پیچھے نہ ہٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے"[2]۔ انھوں نے جواب دیا "اے موسیٰ! وہاں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں، ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم داخل ہونے کے لیے تیار ہیں"۔ اُن ڈرنے والوں میں دو شخص ایسے بھی تھے جن کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا[3]۔ انھوں نے کہا کہ "ان جباروں کے مقابلہ میں دروازے کے اندر گھس جاؤ، جب تم اندر پہنچ جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے، اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم مومن ہو"۔ لیکن انھوں نے پھر یہی کہا کہ "اے موسیٰ ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمھارا رب، دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں"۔ اس پر موسیٰ

(بقیہ سابق) ؎۵ یہ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اس عظمت گذشتہ کی طرف جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کسی زمانہ میں ان کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف جیسے جلیل القدر پیغمبر ان کی قوم میں پیدا ہوئے، اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا، مدت دراز تک یہی اس زمانہ کی مہذب دنیا کے سب سے بڑے فرمانروا تھے اور انہی کا سکہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔ عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰ سے شروع کرتے ہیں، کیونکہ اس سے پہلے کی تاریخ ابھی تک روشنی میں نہیں آئی ہے۔ لیکن قرآن اس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانہ عروج حضرت موسیٰ سے پہلے گذر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎۱ اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کا مسکن رہ چکی تھی۔ مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی سرزمین کو بنی اسرائیل کے لیے نامزد فرمایا۔

؎۲ حضرت موسیٰ کی یہ تقریر اس موقع کی ہے جبکہ مصر سے نکلنے کے بعد آپ اپنی قوم کے ساتھ جزیرہ نمائے سینا کے شمالی حصہ میں (جس کا نام بائیبل میں دشتِ فاران بتایا گیا ہے اور جو عرب کی شمالی اور فلسطین کی جنوبی سرحد سے متصل واقع ہے) مقیم تھے اور اپنی قوم کو فلسطین پر حملہ آور ہونے کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔

؎۳ اصل میں قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ جباروں سے ڈر رہے تھے اُن کے درمیان سے دو شخص بول اُٹھے۔ دوسرا یہ کہ جو لوگ خدا سے ڈرنے والے تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

نے کہا "اے میرے رب! میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر یا میری اپنی ذات یا میرا بھائی، پس تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے"[۱]۔ اللہ نے جواب دیا "اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے، ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ"[۲]۔ ع

(بقیہ سابق) ان میں سے دو شخصوں نے یہ بات کہی۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اس واقعہ کی تفصیل بائیبل کی کتاب گنتی باب ۱۳ و ۱۴ میں بیان ہوئی ہے۔ بائیبل کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے دشت فاران سے بنی اسرائیل کے ۱۲ سرداروں کو فلسطین کا دورہ کرنے کے لیے بھیجا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کر کے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دورہ کر کے وہاں سے واپس آئے اور انھوں نے قوم کے مجمع عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوئے ہیں وہ زور آور ہیں ... ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں .... وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قد آور ہیں اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے"۔ یہ بیان سن کر سارا مجمع چیخ اٹھا کہ "اے کاش ہم مصر ہی میں مرجاتے! یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے! خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھیریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں"۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے کہ "آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنا لیں اور مصر کو لوٹ چلیں"۔ اس پر ان بارہ سرداروں میں سے، جو فلسطین کے دورے پر بھیجے گئے تھے، دو سردار یوشع اور کالب اٹھے اور انھوں نے اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا "چلو ہم ایک دم جا کر اس ملک پر قبضہ کر لیں، کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں"۔ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا "اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا ... فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو .... اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سو ان کا خوف نہ کرو"۔ مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ "انھیں سنگسار کر دو"۔

[۲] یہاں اس واقعہ کا حوالہ دینے کی غرض سلسلۂ بیان پر غور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ قصہ کے پیرایہ میں دراصل یہ جتانا مقصود ہے کہ موسیٰ کے زمانہ میں نافرمانی، انحراف اور پست ہمتی سے کام لے کر جو سزا تم نے پائی تھی اب اس سے بہت زیادہ سخت سزا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں باغیانہ روش اختیار کر کے پاؤ گے۔

اور ذرا انھیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنادو جب اُن دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا "اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے[۱]۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا[۲]، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے[۳] اور اس طرح دوزخی بن کر رہے، ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔" آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے

---

[۱] یعنی تیری قربانی اگر قبول نہیں ہوئی تو یہ میرے کسی قصور کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تجھ میں تقویٰ نہیں ہے، لہٰذا میری جان لینے کے بجائے تجھ کو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

[۲] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مدافعت نہ کروں گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو، میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا، تو میرے قتل کی تدبیریں لگنا چاہے تو تجھے اختیار ہے، لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ تو میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے، یہ کوشش نہ کروں گا کہ پہلے میں ہی تجھے مار ڈالوں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملہ کی مدافعت نہ کرنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے قتل کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ جانتا ہو کہ فلاں شخص اس کی گھات میں لگا ہوا ہے، تب بھی وہ اس کے قتل کی فکر نہ کرے اور اسی کو ترجیح دے کہ ظالمانہ اقدام دوسرے کی طرف سے ہو نہ کہ اُس کی طرف سے۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السلام کے اس نیک بیٹے نے کہی۔

[۳] یعنی بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے قتل کی سعی میں ہم دونوں گناہ گار ہوں، میں اس کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ دونوں کا گناہ تنہا تیرے ہی حصہ میں آجائے، وہ گناہ بھی جو تیرے قاتلانہ اقدام پر ہوگا اور وہ بھی جو میرے حصہ میں لکھا جاتا اگر میں تجھے قتل کرنے کا اقدام کرتا۔

کی تدبیر نکال لیتا۔[۱] اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔[۲]

اسی[۳] وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخشدی۔"[۴] مگر اُن کا حال یہ ہے کہ ہمارے رسول پے درپے ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے پھر بھی ان میں بکثرت لوگ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

---

[۱] اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعہ سے آدم کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر متنبہ کیا، اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجہ کرنے کا موقع مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوّے سے پیچھے کیوں رہ گیا۔ بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ بعد کا فقرہ کہ وہ اپنے کیے پر پچھتایا، اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے۔

[۲] یہاں اس واقعہ کا ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کو اُن کی اس سازش پر لطیف طریقہ سے ملامت کرنا ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر صحابہ کو قتل کرنے کیلئے کی تھی۔ دونوں واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے ان اُمیوں کو قبولیت کا درجہ عطا فرمایا اور اُن پرانے اہل کتاب کو رد کر دیا، سراسر اس بنیاد پر تھی کہ ایک طرف تقویٰ تھا اور دوسری طرف تقویٰ نہ تھا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ جنھیں رد کیا گیا تھا اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے اور اس قصور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے وہ رد کیے گئے تھے، ان پر ٹھیک اسی جاہلیت کا دورہ پڑ گیا جس میں آدم کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا، اور اسی کی طرح وہ ان لوگوں کے قتل پر آمادہ ہو گئے جنھیں خدا نے قبولیت عطا فرمائی تھی۔ حالانکہ ظاہر تھا کہ ایسی جاہلانہ حرکتوں سے اُن کی مردودیت مقبولیت سے نہ بدل جاتی بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہی ہو جاتا۔

[۳] یعنی چونکہ بنی اسرائیل کے اندر اُن صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدم کے اس ظالم بیٹے نے کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھے تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائیبل پائی جاتی ہے وہ فرمان خداوندی کے ان قیمتی الفاظ سے خالی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں[۵۵] اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلا وطن کر دیے جائیں[۵۶]۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں[۵۷] قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ ــــــ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ

(بقیہ سابق) [۵۴] مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا منحصر ہے اس پر کہ افرادِ نوع میں اپنے ابناء نوع کی جان کا احترام اور ان کی زندگی کے بقاء و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ موجود ہو۔ جو شخص ناحق کسی انسان کی جان لیتا ہے وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل اس جذبہ سے خالی ہے، لہٰذا وہ انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اور اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقاء کا انحصار ہے۔

(حواشی صفحۂ ہٰذا) [۵۵] اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کا مطلب وہی ہے جس پر بعد کے فقرے میں روشنی ڈالی گئی ہے، یعنی زمین میں فساد برپا کرنے کی سعی کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی کے لیے اُس نے اپنا رسول بھیجا تھا کہ زمین میں ایک صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر چیز کو جو زمین پر ہے، امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمالِ مطلوب کو پہنچ سکے اور جس کے اندر زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں۔ ایسا نظام جب قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی جو لوگ سعی کریں، قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کرتے ہوں یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور پھر فاسد نظام قائم کر دینے کی کوشش کریں، انھیں یہ آیت اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کا مجرم قرار دیتی ہے، خواہ رسول بذاتِ خود زندہ موجود ہو یا نہ ہو۔ آج کل کے دنیوی قوانین بھی ان لوگوں کو، جو حکومت کا تختہ الٹ دینے اور اس کا نظام درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے ہوں "بادشاہ کے خلاف لڑائی" (Waging war against the King) کا مجرم قرار دیتے ہیں، خواہ وہ ملک کے کسی گوشہ میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ کارروائی کریں اور بادشاہ ان کی دست رس سے کتنا ہی دور ہو۔

[۵۶] یہ مختلف سزائیں بسبیلِ اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امامِ وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی (باقی اگلے صفحہ پر)

اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو[۵۸] اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو[۵۹]، شاید کہ تمھیں کامیابی ہو جائے۔ خوب جان لو کہ جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے، اگر اُن کے

(بقیہ سابق) نوعیت کے مطابق سزا دے۔

۵۷ یعنی اگر وہ بھی فساد سے باز آ جائیں اور صالح نظام کو درہم برہم کرنے یا اُلٹنے کی کوشش چھوڑ دیں، اور اُن کا بعد کا طرزِ عمل ثابت کر رہا ہو کہ وہ امن پسند، مطیعِ قانون، اور نیک چلن انسان بن چکے ہیں، اور اس کے بعد اُن کے سابق جرائم کا پتہ چلے تو اُن سزاؤں میں سے کوئی سزا اُن کو نہ دی جائے گی جو اوپر بیان ہوئی ہیں، البتہ آدمیوں کے حقوق پر جو دست درازی انھوں نے کی تھی اس کی ذمہ داری ان پر سے ساقط نہ ہوگی۔ مثلاً اگر کسی انسان کو انھوں نے قتل کیا تھا یا کسی کا مال لیا تھا یا کوئی اور جرم انسانی جان و مال کے خلاف کیا تھا تو اسی کا مقدمہ ان پر قائم کیا جائے گا نہ کہ اللہ اور رسول سے محاربہ کرنے کا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۸ یعنی ہر اس ذریعہ کے طالب اور جویاں رہو جس سے تم اللہ کا تقرب حاصل کر سکو اور اس کی رضا کو پہنچ جاؤ۔

۵۹ اصل میں لفظ جَاهِدُوْا استعمال فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم محض "جدوجہد" سے پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مجاہدہ کا لفظ مقابلہ کا مقتضی ہے اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہیں، جو تم کو خدا کی مرضی کے مطابق چلنے سے روکتی اور اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں، جو تم کو پوری طرح خدا کا بندہ بن کر نہیں رہنے دیتیں اور تمھیں اپنا یا کسی غیر اللہ کا بندہ بننے پر مجبور کرتی ہیں، ان کے خلاف اپنی تمام امکانی طاقتوں سے جدوجہد کرو کہ اسی جدوجہد پر تمھاری فلاح و کامیابی کا اور خدا سے تمھارے تقرب کا انحصار ہے۔ اس طرح یہ آیت بندۂ مومن کو ہر محاذ پر چومکھی لڑائی لڑنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ایک طرف ابلیس لعین اور اس کا شیطانی لشکر ہے، دوسری طرف آدمی کا اپنا نفس اور اس کی سرکش خواہشات ہیں، تیسری طرف خدا سے پھرے ہوئے بہت سے انسان ہیں جن کے ساتھ آدمی ہر قسم کے معاشرتی، تمدنی اور معاشی تعلقات میں بندھا ہوا ہے، اور چوتھی طرف وہ غلط مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام ہیں جو خدا سے بغاوت پر قائم ہوئے ہیں اور بندگیِ حق کے بجائے بندگیِ باطل پر انسان کو مجبور کرتے ہیں۔ ان سب کے حربے مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کوشش ہے کہ آدمی کو خدا کے بجائے اپنا مطیع بنائیں۔ بخلاف اس کے آدمی کی ترقی کا (باقی اگلے صفحہ پر)

قبضہ میں ساری زمین کی دولت ہو اور اتنی ہی اور اس کے ساتھ، اور وہ چاہیں کہ اسے فدیہ میں دے کر روزِ قیامت کے عذاب سے بچ جائیں، تب بھی وہ ان سے قبول نہ کی جائے گی اور انھیں دردناک سزا مل کر رہے گی۔ وہ چاہیں گے کہ دوزخ کی آگ سے نکل بھاگیں مگر نہ نکل سکیں گے اور انھیں قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا۔

اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو لہ، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے

(بقیہ سابق) اور تقرب خداوندی کے مقام تک اس کے عروج کا انحصار بالکلیہ اس پر ہے کہ وہ سراسر خدا کا مطیع اور باطن سے لے کر ظاہر تک خالصۃً اس کا بندہ بن جائے۔ لہٰذا اپنے مقصود تک اس کا پہنچنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام مانع و مزاحم قوتوں کے خلاف بیک وقت جنگ آزما ہو، ہر وقت ہر حال میں ان سے کشمکش کرتا رہے اور ان ساری رکاوٹوں کو پامال کرتا ہوا خدا کی راہ میں بڑھتا چلا جائے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ دونوں ہاتھ نہیں بلکہ ایک ہاتھ، اور اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلی چوری پر سیدھا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ لا تقطع علی خائن۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرقہ کا اطلاق خیانت وغیرہ پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اس فعل پر ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو اس کی حفاظت سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ ایک ڈھال کی قیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بروایت عبد اللہ بن عباس دس درہم، بروایت ابن عمر تین درہم، بروایت انس بن مالک ۵ درہم اور بروایت حضرت عائشہ ایک چوتھائی دینار ہوتی تھی۔ اسی اختلاف کی بنا پر فقہاء کے درمیان کم سے کم نصاب سرقہ میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک سرقہ کا نصاب دس درہم ہے اور امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک چوتھائی دینار (اُس زمانہ کے درہم میں تین ماشہ ۱½ رتی چاندی ہوتی تھی۔ اور ایک چوتھائی دینار ۳ درہم کے برابر تھا)۔

پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ لا قطع فی ثمرۃ ولا کثر۔ لا قطع فی طعام۔ اور حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ لم یکن قطع السارق علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الشیء التافہ۔ حضرت علی اور حضرت عثمان کا فیصلہ ہے اور صحابہ کرام میں سے (باقی اگلے صفحہ پر)

عبرتناک سزا، اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی، اللہ بہت درگذر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔[سلہ] کیا تم جانتے نہیں کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک ہے، جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کرے، وہ ہر چیز کا اختیار رکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے کہ لا قطع فی الطیر۔ نیز سیدنا عمر و علی رضی اللہ عنہما نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا اور اس معاملہ میں بھی صحابہ کرام میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ ان مآخذ کی بنیاد پر مختلف ائمہ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطع ید کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ترکاریاں، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو، کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں بھی وہ قطع ید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان چوریوں پر سرے سے کوئی سزا ہی نہ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) سلہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کرلے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کرکے اللہ کا صالح بندہ بن جائے وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھودے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو چوری کی صفت سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس کا ہاتھ کاٹا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہو گیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی، اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اسی لیے قرآن مجید چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو انتظام تمدن کے لیے ہے، اس سزا سے نفس پاک نہیں ہو سکتا۔ نفس کی پاکی صرف توبہ اور رجوع الی اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

مقالات

اسلام میں مُرتد کا حکم

کیا اسلام میں تبلیغ کفر کی اجازت ہے؟

(۵)

جوابی کارروائی کا خطرہ صحبت گزشتہ میں ہم نے دنیا کے دوسرے نظاموں سے سزائے ارتداد کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ایک اور الجھن کو بھی رفع کر دیتی ہیں جو اس مسئلہ میں اکثر سطحی النظر لوگوں کے دماغ کو پریشان کیا کرتی ہے۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ اگر دوسرے ادیان بھی اسی طرح اپنے دائرے سے باہر جانے والوں کے لیے سزائے موت کا قانون مقرر کر دیں جس طرح اسلام نے کیا ہے، تو یہ چیز اسلام کی تبلیغ کے راستہ میں بھی ویسی ہی رکاوٹ بن جائے گی جیسی دوسرے ادیان کی راہ میں بنتی ہے۔ اس کا اصولی جواب اس سے پہلے ہم دے چکے ہیں، مگر یہاں ہمیں اس کا عملی جواب بھی مل جاتا ہے۔ معترضین ناواقفیت کی بنا پر ایسا اعتراض لفظ "اگر" کے ساتھ پیش کرتے ہیں، گویا کہ واقعہ یہ نہیں ہے، حالانکہ دراصل وہ چیز جس کا یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں، واقعہ کی صورت میں موجود ہے۔ دنیا میں جو دین بھی اپنی ریاست رکھتا ہے وہ اپنے حدود اقتدار میں ارتداد کا دروازہ بزور بند کیے ہوئے ہے۔ غلط فہمی صرف اس وجہ سے واقع ہوتی ہے کہ آج کل کی عیسائی قومیں اپنی مملکتوں میں عیسائیت سے مرتد ہو جانے والوں کو کسی قسم کی سزا نہیں دیتیں اور ہر شخص کو آزادی عطا کر دیتی ہیں کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے۔ اس سے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان کے قانون میں ارتداد جرم نہیں ہے اور یہ ایک رحمت ہے جس کی وجہ سے مذہبی تبلیغ تمام رکاوٹوں سے آزاد ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت ان قوموں کے افراد کا محض ایک شخصی مذہب ہے، ان کا "اجتماعی دین" نہیں ہے جس پر ان کی سوسائیٹی کا نظام اور ان کے اسٹیٹ کی عمارت قائم ہو، اس لیے عیسائیت سے پھر جانے کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں کہ اس پر رکاوٹ عائد کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔ رہا ان کا دین جس پر ان کی سوسائیٹی اور ریاست کی بنیاد قائم ہے،

تو اس سے مرتد ہونے کو وہ بھی اسی طرح جرم قرار دیتی ہیں جس طرح اسلام اسے جرم قرار دیتا ہے اور اس کو دبانے کے معاملہ میں وہ بھی اُتنی ہی سخت ہیں جتنی اسلامی ریاست سخت ہے۔ انگریزوں کا اجتماعی دین عیسائیت نہیں ہے بلکہ برطانوی قوم کا اقتدار اور برطانوی دستور و آئین کی فرمانروائی ہے جس کی نمائندگی تاج برطانیہ کرتا ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کا اجتماعی دین بھی عیسائیت نہیں بلکہ امریکی قومیت اور وفاقی دستور کا اقتدار ہے جس پر ان کی سوسائٹی ایک ریاست کی شکل میں منظم ہوئی ہے۔ اسی طرح دوسری عیسائی قوموں کے اجتماعی دین بھی عیسائیت کے بجائے ان کے اپنے قومی اسٹیٹ اور دستور ہیں۔ اس دین سے ان کا کوئی پیدائشی یا اختیاری تابع ذرا مرتد ہو کر دیکھ لے، اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ہاں ارتداد جرم ہے یا نہیں۔

اس معاملہ کو انگریزی قانون کے ایک مصنف نے خوب واضح کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ہم یہاں تفصیل کے ساتھ ان وجوہ کی تحقیق نہیں کرنا چاہتے جن کی بنیاد پر ریاست نے مذہب کے خلاف بعض جرائم پر سزا دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض خاص افعال یا طرزِ عمل جو مذہب میں ممنوع ہیں، اجتماعی زندگی کے لیے بھی خرابی اور بدنظمی کے موجب ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ افعال غیر قانونی اور ان کے مرتکب مستلزم سزا قرار دیے گئے ہیں، نہ اس وجہ سے کہ وہ خدا کے قانون کو توڑتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ملکی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔"

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:۔

"ایک زمانۂ دراز تک انگریزی قانون میں ارتداد یعنی عیسائیت سے بالکل پھر جانے کی سزا موت تھی۔ بعد میں یہ قانون بنایا گیا کہ اگر کوئی شخص جس نے عیسائیت کی تعلیم حاصل کی ہو یا عیسائی مذہب کی پیروی کا اقرار کیا ہو، تحریر یا طباعت یا تعلیم یا سوچی سمجھی ہوئی تقریر کے سلسلہ میں اس خیال کا اظہار کرے کہ خدا ایک کے بجائے متعدد ہیں، یا عیسائی مذہب کے حق ہونے سے یا کتاب مقدس کے من جانب اللہ ہونے سے انکار کرے، تو پہلی خطا پر وہ ملکی اور فوجی ملازمت میں داخل ہونے سے محروم کیا جائے گا اور دوسری خطا پر اسے تین سال کے لیے قید کی سزا دی جائے گی لیکن

یقین کیا جاتا ہے کہ اس قانون کے تحت کبھی کسی شخص پر مقدمہ نہیں چلایا گیا"۔[ه]

چند سطور کے بعد پھر لکھتا ہے :-

"کہا گیا ہے کہ عیسائیت انگریزی قانون کا ایک جزء ہے اور اس کے خلاف کسی فاحش حملے کے ارتکاب پر ریاست کی طرف سے سزا دی جاتی ہے۔ اس جرم کے حدود میں تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے خدا کی ہستی یا اس کی تقدیر کا انکار، ہمارے خداوند اور منجی مسیح کی اہانت، اور کتب مقدسہ یا ان کے کسی جزء کا استہزا شامل ہے۔ ..... اس پر صرف اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اس قانون کو شاذونادر ہی کبھی استعمال کیا گیا ہے"۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ عیسائیت (یعنی جسے وہ "خدا کا قانون" کہتے ہیں) چونکہ اب ملکی قانون نہیں ہے، اس لیے ریاست اول تو اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو سزا دینے کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہی نہیں، یا اگر اس بنا پر کہ ابھی تک یہ عیسائیت حکمران افراد کا مذہب ہے، وہ برائے نام اس ذمہ داری کو قبول کرتی بھی ہے تو عملاً اس کو ادا کرنے سے پہلو تہی کرتی ہے لیکن خود ملکی قانون، جو دراصل ان کا اجتماعی دین ہے، کیا اس کے معاملہ میں بھی ان کا طرزِ عمل یہی ہے؟ اس کا جواب آپ عملاً پا سکتے ہیں اگر ذرا ہمت کر کے برطانوی حدود میں رہتے ہوئے تاجِ برطانیہ کے اقتدارِ اعلیٰ اور سلطنت کے آئین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

پس درحقیقت وہ حالت عملاً قائم ہے جس کے متعلق غلط فہمی کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ "اگر" ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ البتہ مذہبی تبلیغ میں اس حالت کے قائم ہونے سے کوئی رکاوٹ اس لیے واقع نہیں ہوتی کہ جن مختلف مذاہب کی تبلیغ کی جاری ہے ان میں سے کسی کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب میں چلے جانے سے اس اجتماعی دین میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا جو عملاً ملک پر مسلط ہے۔ تمام مذاہب بالفعل اس دین کے تابع ہیں اور اُن حدود کے پابند ہیں جن میں اس نے انھیں محدود کر دیا ہے۔ لہٰذا اس کے تابع فرمان اور مطیع امر رہتے ہوئے اگر آپ نے ایک مذہبی عقیدہ و عمل کو چھوڑ کر دوسرا مذہبی عقیدہ و عمل اختیار کر لیا تو اس کے نقطۂ نظر سے فی الواقع آپ کے اندر کوئی فرق رونما نہیں ہوا، نہ آپ نے کسی ارتداد کا ارتکاب کیا کہ

ه *Principles of the Criminal Law.*
by Seymour F. Harris, London, 1912, p. 61.

وہ آپ سے باز پرس کرے۔ ہاں اگر آپ اس اجتماعی دین کے اعتقاداً و عملاً کافر بن جائیں، اور کسی دوسرے اجتماعی دین کے اعتقادی مومن بن کر عملی مسلم بننے کی کوشش کریں، تو آج کا ہر حکمراں آپ کے ساتھ وہی کچھ کرنے کے لیے تیار ہے جو آج سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے کا حکمراں حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنے کے لیے تیار ہوا تھا کہ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ أَن يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ (المومن - ۳)

پیدائشی مسلمانوں کا مسئلہ

اس سلسلہ میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو "قتل مرتد" کے حکم پر بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا، پھر اس نے باختیار خود اسلام قبول کیا اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کرلیا، اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلطی کی، کیوں نہ وہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے، لیکن اس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام کو خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی منافقوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔

اس شبہ کا ایک جواب اصولی ہے اور ایک عملی۔ اصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری اتباع کے درمیان احکام میں نہ فرق کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ ہر دین اپنے پیرووں کی اولاد کو فطرۃً اپنا پیرو قرار دیتا ہے اور ان پر وہ سب احکام جاری کرتا ہے جو اختیاری پیرووں پر جاری کیے جاتے ہیں۔ یہ بات عملاً ناممکن اور عقلاً بالکل لغو ہے کہ پیروانِ دین، یا بیاسی اصطلاح میں رعایا اور شہریوں کی اولاد کو ابتداءً لقار یا اغیار (Aliens) کی حیثیت سے پرورش کیا جائے اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو اس بات کا فیصلہ اُن کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ اس دین کی پیروی یا اُس اسٹیٹ کی وفاداری قبول کرتے ہیں یا نہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام دنیا میں کبھی چل ہی نہیں سکتا۔ اجتماعی نظام کے بقاء و استحکام کا زیادہ تر انحصار اُس مستقل آبادی پر ہوتا ہے جو اُس

کی پیروی پر ثابت و قائم اور اس کے تسلسل حیات کی ضامن ہو، اور ایسی مستقل آبادی صرف اسی طرح بنتی ہے کہ نسل کے بعد نسل آکر اس نظام کو جاری رکھنے کی ذمہ داری لیتی چلی جائے۔ اگر پیروؤں اور شہریوں کی ہر نسل کے بعد دوسری نسل کا اس پیروی و شہریت پر قائم رہنا اور اس نظام کو برقرار رکھنا مشتبہ اور غیر یقینی ہو، تو اجتماعی نظام کی بنیاد دائماً متزلزل رہے گی اور کبھی اس کو استحکام نصیب ہی نہ ہوگا۔ لہٰذا پیدائشی پیروی و شہریت کو اختیاری میں تبدیل کر دینا، اور ہر بعد کی نسل کے لیے پہلی نسل کے دین اور دستور و آئین اور تمام وفاداریوں سے انحراف کا دروازہ کھلا رکھنا، ایک ایسی تجویز ہے جو بجائے خود سخت نامعقول ہے، اور دنیا میں آج تک کسی دین، کسی اجتماعی نظام اور کسی ریاست نے اس کو اختیار نہیں کیا ہے۔

اس کا عملی جواب یہ ہے کہ جو اندیشہ ہمارے معترضین بیان کرتے ہیں وہ درحقیقت عملی دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوتا۔ ہر اجتماعی نظام جس میں کچھ بھی زندگی کی طاقت اور خواہش موجود ہو، پوری توجہ کے ساتھ اس کا انتظام کیا کرتا ہے کہ اپنے دائرے میں پیدا ہونے والی نئی نسلوں کی طرف اپنی روایات، اپنی تہذیب، اپنے اصولوں، اور اپنی وفاداریوں کو منتقل کرے اور انھیں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد بنائے۔ اس تعلیم و تربیت کی وجہ سے نئی نسلوں کی بہت بڑی اکثریت ۹۹ فی صدی سے بھی زیادہ اکثریت اس نظام کے اتباع پر راضی، اور اس کی وفادار بن کر اُٹھتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ ان حالات میں صرف چند ہی افراد ایسے پیدا ہو سکتے ہیں جو مختلف وجوہ سے انحراف و بغاوت کا میلان لیے ہوئے اٹھیں یا بعد میں اس کا اکتساب کرلیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے چند افراد کی خاطر اصول میں کوئی ایسا تغیر نہیں کیا جا سکتا جس سے پوری سوسائٹی کی زندگی خطرے اور بے اطمینان میں مبتلا ہو جائے۔ یہ افراد اگر اجتماعی دین سے انحراف کرنا چاہیں تو ان کے لیے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو ریاست کے حدود سے باہر جا کر اس سے انحراف کریں۔ یا اگر وہ اپنے انحراف میں راسخ ہیں، اور جس دوسرے نظام کو انھوں نے پسند کیا ہے اس کی پیروی میں صادق الایمان ہیں، اور اپنے آبائی دین کی جگہ اُسے قائم کرنے کا سچا عزم رکھتے ہیں، تو اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالیں اور جان جوکھوں کا وہ کھیل کھیلیں جس کے بغیر کسی نظام کو تبدیل

نہیں کیا جا سکتا۔

پس جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے، وہ بہرحال یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانونِ اسلام کی طرف سے ان کے لیے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھرے گا تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرینِ علمِ شریعت کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس معاملہ کا ایک پہلو ایسا ہے جس میں مجھے کچھ پیچیدگی نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک مدت دراز سے ہمارا اجتماعی نظام نہایت ڈھیلا اور سست رہا ہے اور ہمارے ہاں کئی نسلیں ایسی گذر چکی ہیں کہ ہر نسل نے بعد کی نسل کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے میں سخت کوتاہی کی ہے اور بے پروائی کے ساتھ یا جان بوجھ کر اپنی اولاد کو کافرانہ تعلیم و تربیت کے حوالہ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے ہاں بغاوت وانحراف کے میلانات رکھنے والوں کا تناسب خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے اور بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اگر آگے چل کر کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت قائم ہوا اور قتلِ مرتد کا قانون نافذ کر کے ان سب لوگوں کو بزور اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیے جاتے ہیں، تو اس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہے گا۔ میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے، واللہ الموفق للصواب، کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دیدیا جائے کہ "جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا، تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کیے جائیں گے، فرائض وواجباتِ دینی کے التزام پر انھیں مجبور کیا جائے گا، اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔" اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا

جائے، پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں، انھیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لیے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں

۴۔ تبلیغ کفر کا مسئلہ

سائل کا آخری سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت کے دائرے میں تبلیغ کفر کی اجازت نہیں ہے تو عقلی حیثیت سے اس ممانعت کو کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے ؟

اس باب میں کوئی بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جس تبلیغ کفر کی اسلام ممانعت کرتا ہے اُس کی نوعیت واضح کر دی جائے۔ اسلام اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ دارالاسلام کے حدود میں کوئی غیر مسلم اپنے بچے کو اپنے مذہب کی تعلیم دے یا اپنے مذہب کے عقائد اور اصول لوگوں کے سامنے تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے بیان کرے، یا اسلام پر اگر وہ کچھ اعتراضات رکھتا ہو تو انھیں تہذیب کے ساتھ تقریر و تحریر میں پیش کرے۔ نیز اسلام اس میں بھی مانع نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کے خیالات سے متاثر ہو کر دارالاسلام کی ذمی رعایا میں سے کوئی شخص اُس کا مذہب قبول کرلے۔ ممانعت دراصل جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ کسی مذہب یا نظام فکر و عمل کی تائید میں کوئی ایسی منظم تحریک اٹھائی جائے جو دارالاسلام کے حدود میں رہنے والوں کو اُس مذہب یا نظام کی طرف دعوت دے۔ ایسی منظم دعوت، قطع نظر اس سے کہ وہ ذمیوں میں سے اُٹھے یا باہر سے آنے والے غیر مسلموں کی طرف سے، بہر حال اسلام اپنی حدود میں اس کے ظہور کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ ایک منظم دعوت لامحالہ یا تو سیاسی نوعیت کی ہوگی، یا مذہبی و اخلاقی نوعیت کی۔ اگر وہ سیاسی نوعیت کی ہو اور اس کے پیش نظر نظام زندگی کا تغیر ہو تو جس طرح دنیا کی ہر ریاست ایسی دعوت کی مزاحمت کرتی ہے، اسی طرح اسلامی ریاست بھی کرتی ہے۔ اور اگر وہ دوسری نوعیت کی دعوت ہو تو خالص دنیوی ریاستوں کے برعکس اسلام اسے اس لیے گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی اعتقادی و اخلاقی گمراہی کو اپنی نگرانی و حفاظت میں سر اُٹھانے کا موقع دینا قطعی طور پر اُس مقصد کی ضد ہے جس کے لیے اسلام ملک کی زمام کار اپنے ہاتھ

میں لیتا ہے۔ اس معاملہ میں خالص دنیوی حکومتوں کا طرزِ عمل اسلامی حکومت کے طرزِ عمل سے یقیناً مختلف ہے کیونکہ دونوں کے مقاصدِ حکومت مختلف ہیں۔ دنیوی حکومتیں ہر جھوٹ، ہر اعتقادی فساد اور ہر قسم کی بدعملی و بداخلاقی کو اور اسی طرح ہر مذہبی گمراہی کو بھی اپنے حدود میں پھیلنے کی اجازت دیتی ہیں اور خوب ڈھیلی رسّی چھوڑے رکھتی ہیں جب تک کہ اِن مختلف چیزوں کے پھیلانے والے اُن کے وفادار رہیں، اُن کو ٹیکس ادا کرتے رہیں اور ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے اُن کے سیاسی اقتدار پر آنچ آتی ہو۔ البتہ جن تحریکوں سے اپنے سیاسی اقتدار پر آنچ آنے کا انھیں ذرا سا بھی خطرہ ہوجاتا ہے ان کو خلافِ قانون قرار دینے اور قوت سے کچل دینے میں وہ ذرہ برابر تأمل نہیں کرتیں۔ اُن کے اس طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ انھیں بندگانِ خدا کی اخلاقی و روحانی فلاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ان کے لیے تو اپنا سیاسی اقتدار اور اپنی مادّی اغراض ہی سب کچھ ہیں۔ مگر اسلام کو اصل دلچسپی خدا کے بندوں کی روحانی و اخلاقی فلاح سے ہے اور اسی کی خاطر وہ انتظامِ ملکی اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، اس لیے وہ سیاسی فساد یا انقلاب برپا کرنے والی تحریکوں کی طرح اُن تحریکوں کو بھی برداشت نہیں کرسکتا جو اخلاقی فساد یا اعتقادی گمراہی پھیلانے والی ہوں۔

یہاں پھر وہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے جو قتلِ مرتد کے مسئلہ میں آیا کرتا ہے، یعنی یہ کہ اگر غیر مسلم حکومتیں بھی اسی طرح اپنے حدود میں اسلام کی دعوت کو خلافِ قانون قرار دے دیں تو کیا ہو؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام اِس قیمت پر حق و صداقت کی اشاعت کی آزادی خریدنا نہیں چاہتا کہ اس کے جواب میں اسے جھوٹ اور باطل کی اشاعت کی آزادی دینی پڑے۔ وہ اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ اگر تم سچے دل سے مجھے حق سمجھتے ہو اور میری پیروی ہی میں اپنی اور انسانیت کی نجات دیکھتے ہو تو میری پیروی کرو، مجھے قائم کرو اور دنیا کو میری طرف دعوت دو خواہ اس کام میں تم کو گلزارِ ابراہیم سے سابقہ پیش آئے یا آتشِ نمرود سے گذرنا پڑے۔ یہ تمھارے اپنے ایمان کا تقاضا ہے اور یہ بات تمھاری خداپرستی پر منحصر ہے کہ اس کی رضا چاہتے ہو تو اِس تقاضے کو پورا کرو ورنہ نہ کرو۔ لیکن میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ تم کو اس راہ کی خطرناکیوں سے بچانے اور اسے تمھارے لیے سراسر سہولت بنا دینے کی خاطر باطل پرستوں کو یہ جوابی "حق" عطا کروں کہ وہ خدا کے بندوں کو گمراہ کریں اور ایسے راستوں پر انھیں ہانک

لے جائیں جن میں مجھے معلوم ہے کہ اُن کے لیئے تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ اسلام کا ناقابل تغیر فیصلہ ہے اور اس میں وہ کسی سے مصالحت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر غیر مسلم حکومتیں آج یا آئندہ کسی وقت اسلام کی تبلیغ کو اسی طرح جرم قرار دیں جس طرح وہ پہلے اسے جرم قرار دیتی رہی ہیں تب بھی اس فیصلہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کے لیے وہ گھڑی بہت منحوس تھی جب کفار کی نگاہ میں وہ اتنا بے ضرر بن گیا کہ اس کی دعوت و تبلیغ کو وہ بخوشی گوارا کرنے لگے اور قانون کفر کی حفاظت ونگرانی میں اسے پھیلنے کی پوری سہولتیں بہم پہنچنے لگیں۔ اسلام کے ساتھ کفر کی یہ رعائتیں حقیقت میں خوش آیند نہیں ہیں۔ یہ تو اس بات کی علامت ہیں کہ اسلام کے قالب میں اس کی روح موجود نہیں رہی ہے، ورنہ آج کے کافر کچھ نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب سے بڑھ کر نیک دل نہیں ہیں کہ اس مسلم نما قالب میں اسلام کا اصلی جوہر موجود ہو اور پھر بھی وہ اسے اپنی سرپرستی وحمایت سے سرفراز کریں یا کم از کم اسے پھیلنے کی آزادی ہی عطا کر دیں۔ جب سے ان کی عنایات کی بدولت اسلام کی دعوت محض گلزار ابراہیم کی گلگشت بن کر رہ گئی اسی وقت سے اسلام کو یہ ذلت نصیب ہوئی کہ وہ ان مذاہب کی صف میں شامل کر دیا گیا جو ہر ظالم نظام تمدن و سیاست کے ماتحت آرام کی جگہ پا سکتے ہیں۔ بڑی مبارک ہو گی وہ ساعت جب یہ رعائتیں واپس لے لی جائیں گی اور دین حق کی طرف دعوت دینے والوں کی راہ میں پھر آتش نمرود حائل ہو جائیگی۔ اسی وقت اسلام کو وہ سچے پیرو اور داعی ملیں گے جو طاغوت کا سر نیچا کر کے حق کو اس پر غالب کرنے کے قابل ہوں گے۔

اگر کوئی صاحب ۱۹۴۳ء کا فائل فروخت کرنا چاہیں یا ۱۹۴۳ء کے ابتدائی تین چار ماہ کے پرچے فروخت کرنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ (مینیجر)

ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے، گیلانی الیکٹرک پریس، ہسپتال روڈ، لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ، سے شائع کیا۔

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی.

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۴۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ضخامت ۵۲۸ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں   مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا　　　　اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اہمیت حاصل ہے، محتاج بیان نہیں۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے۔ کر رہا ہے، اور کرتا رہے گا۔ انشاءاللہ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس میں جن اہم اور معرکۃالارا مسائل پر
گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ڈارون کا نظریہ ارتقا
- لباس کا مسئلہ
- غلامی کا مسئلہ
- نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال

ضخامت ($\frac{20 \times 26}{8}$) ۳۳۶ صفحات　　　　قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ - لاہور

سرورق رپن پرنٹنگ پریس - بل روڈ، لاہور میں چھپا